غالبِ اور فنِ تنقید

مجموعہ

اخلاق حسین عارف

غ
ا

غالب اکیڈمی نئی دہلی 13

غالب اور فن تنقید

اخلاق حسین عارف

غالب اکیڈمی ۔ نظام الدین ۔ نئی دلّی

ک

غالب اکیڈمی

اشاعت اوّل دسمبر ۱۹۷۶ء
تعداد ایک ہزار
ناشر:۔ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین دہلی - ۱۳

قیمت:۔ پچیس ۲۵ روپے

جمال پرنٹنگ پریس دہلی - ۶

انتساب

میں اپنی اِس حقیر کاوش کو

مُحسنِ ادب ماہرِ غالبیات جناب مالک رام صاحب دام اقبالہٗ

کے نامِ نامی سے معنون کرتا ہوں۔

ناچیز:

اخلاق حسین عارف

فہرست

تعارف

(پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی)

اب اس حقیقت کا اعتراف عام طور پر کیا جانے لگا ہے کہ ہر تخلیقی فن کار میں تنقیدی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وادی فن میں اس کی راہبر اور رہنما ہوتی ہے اور اسی کی مدد سے وہ اپنی تخلیق کو ان نقائص سے بچاتا ہے جو اظہار کے جوش میں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اردو شعرا میں اس کی سب سے اچھی مثال مرزا غالب کی ذات ہے جن کا شعور فن ان کے سفر تخلیق کو آسان بناتا ہے۔ ہر اچھے شاعر نے کسی نہ کسی شکل میں اپنے نظریہ شعر کی طرف اشارے کئے ہیں اور اپنے طریق کار پر روشنی ڈالی ہے۔ کبھی یہ بات واضح رہتی ہے کبھی مبہم لیکن غالب نے نہ صرف اپنی شاعری میں اسکے دھندلے نقوش پیش کئے ہیں بلکہ اپنے سیکڑوں فارسی، اردو خطوط اور متعدد نگارشات میں فن شعر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ لغت، قواعد، صنائع، محاورہ اور روزمرہ کے علاوہ انھوں نے کبھی خود اپنے اشعار کی تشریح کر کے اور کبھی دوسروں کے کلام کی وضاحت یا کسی شاگرد کے کلام پر اصلاح دے کر اپنی تنقیدی نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر ایسے تمام مقامات کو یکجا کر دیا جائے تو یہ کام نہ صرف علمی حیثیت سے مفید ہوگا بلکہ مرزا غالب کے سمجھنے میں بھی معین ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ اخلاق حسین صاحب عارف نے بڑی دیدہ ریزی اور ہوشمندی سے یہ کام انجام دیا ہے اور غالب کی اکثر فارسی اردو نگارشات کو کھنگال کر وہ چیزیں یکجا کر دی ہیں جن سے انکی فنکاری کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

جس نے بھی غالب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اس نے محسوس کیا ہوگا کہ انھوں نے کبھی اپنے طور پر اور کبھی کسی کے استفسار پر بعض ادبی نکات کی ایسی وضاحت کی ہے جس سے ان کی معنویت روشن ہوگئی ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اردو کے اہم شعرا میں مرزا غالب ہی کو سب سے مختلف قسم کے ادبی مسائل سے الجھنے کا موقع ملا اسی وجہ سے ان کے خط ادبی بحثوں سے بھی بھرے ہوئے ہیں۔ کسی خط میں کسی شاگرد کو فن کے نکتے سمجھائے ہیں، کسی میں غلطی پر ٹوکا ہے، کسی میں اپنی انا (ایغو) کو تسکین دینے کے لیے اپنی فارسی دانی کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ کسی میں اپنے کلام کی داد چاہی ہے۔ کسی میں کسی فارسی شاعر یا لغت نویس کا مذاق اڑایا ہے کسی میں جی کھول کر تعریف کی ہے۔ اس طرح یہ خطوط ان کی نجی زندگی اور تاریخی حقائق کے علاوہ ادبی معلومات کا بھی خزانہ بن گئے ہیں۔

اخلاق حسین صاحب عارف نے ان چیزوں کو یکجا کر کے ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ بظاہر یہ کام آسان ہے لیکن اول تو ہر کام جب انجام پا جاتا ہے آسان نظر آتا ہے دوسرے یہ کہ اس قسم کی یہ پہلی کوشش ہے اس لیے اس محنت کا اندازہ دشوار ہے جو مرتب کو کرنا پڑی ہے۔ اس لیے وہ ہماری نیک تمناؤں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے دوسرے کام کرنے والوں کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ خطوط اقتباسات اور اشعار کی تشریح کو محض ادبی لطائف سمجھ کر پڑھنا غالب کی معنی آفرینی پر ظلم ہوگا۔ انھیں دیکھ کر ان کی مدد سے غالب کے نظریۂ شاعری اور تصوّرِ فن کا تجزیہ کرنا غالب شناسی کے راز کھولے گا۔ یہی اس مواد کی افادیت ہے جو اس تالیف میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ مرتب کی یہ کوشش پسند کی جائے گی۔

سید احتشام حسین

عرضِ مدعا

یہ حقیقت ہے کہ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ کو خالقِ کائنات نے عجیب دل و دماغ ودیعت فرمایا تھا اور انھیں وہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جو عدیم النظیر تھیں غالبؔ کو اس کا پورا احساس تھا مگر زمانہ کی بے حسی اور کوتاہ نگاہی پر ان کا دل ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا باوجود اس کے ان کی خود اعتمادی میں کسی نوع کی کمی نہیں واقع ہونے پائی۔ انھوں نے اگر شاعری کے لیے ایک نئی راہ تلاش کی تو نثر نگاری کے لیے بھی جدید رجحانات کو اپنایا۔ نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات تلاش کیے تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی سے گلستانِ شاعری کو اس طرح آراستہ کیا کہ شاعری میں چار چاند لگ گیے۔ اسی طرح نثر کو چھوٹے چھوٹے بامعنی جملوں سے مرصع، تصنع سے پاک، شوخی۔ زندہ دلی اور ظرافت، عزم و استقلال کا دامن تھامے آراستہ و پیراستہ کیا۔ فطرت نے یہ عطیہ صرف انھیں کو عنایت کیا جو ان ہی پر ختم بھی ہو گیا اگرچہ کہ شعراء و نثر انشاپردازوں نے ان کی طرز کو اپنانا چاہا مگر منزل کجا اس رہبر کاروان شعر و ادب کی گرد پا کو بھی نہ پا سکے اور بالآخر ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گیے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

غالب نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو میں بھی۔ ان کے دواوین اسکی زندہ جاوید حقیقتیں ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فارسی میں مکتوبات لکھے اور اردو میں بھی۔ اردو میں جو مکتوبات ہیں ان کی تعداد تقریباً ہزار تک پہنچتی ہے جن سے غالب کے نجی معاملات کے علاوہ اس دور کے سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی نشان دہی ہوتی ہے نیز ان میں ایسے بھی بہت سے خطوط ہیں جن میں انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفیقوں کے کلام پر اصلاح دی ہے اور فنِ تنقید کے اصول سے روشناس کرایا ہے۔ صاحبزادہ سیّد محمد عباس علی خاں بہادر بیتاب کے نام غالب کے خطوط اس جہت سے اہم ہیں ساتھ ہی ساتھ مفید بھی کہ ان کے ذریعہ غالب کا اصول اصلاح شعرا اہلِ ادب کے مطالعہ میں آئے گا۔ ان کے کلام کا معتد بہ حصہ ایسا ہے جس کی تشریح انھوں نے مکتوبات میں کر دی ہے بہت سے اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے ان کے مطالب واقعہ کی تشریح کے ساتھ قلم بند کر دئے ہیں۔ بہت سے اشعار انھوں نے مکتوبات میں ایسے استعمال کئے ہیں جن سے لطف اندوزی کے ہمدوش اس سے بھی واقفیت بہم پہنچتی ہے کہ وہ اشعار انھوں نے کب اور کس موقع پر کہے۔ بہت سے مکتوبات اس اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہیں کہ ان میں جابجا برمحل اشعار استعمال کیے ہیں اور تاریخی پس منظر بھی دیدیا ہے

راقم الحروف نے انھیں خطوط میں سے ایسے مکتوبات منتخب کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ حقیر کاوش کس حد تک کامیاب ہوئی اس کا تجزیہ ناقدینِ فن اور وہ مایۂ نازِ اہلِ قلم کر سکتے ہیں جو غالب پر کافی تحقیقی کام کر چکے ہیں میری کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کے ضمن میں ان حضرات کا بزرگانہ و مشفقانہ مشورہ میرے لیے انتہائی بیش قیمت ہوگا۔

خادم ادب

اخلاق حسین عارف

۱۵۔ بارود خانہ، لکھنؤ نمبرا

فن تحقیق و تنقید کے لیے بڑی ریاضت اور کاوش درکار ہے۔ اسکے لیے بھی اعلیٰ فنون کی طرح خاص یکسوئی اور انہماک کی ضرورت ہے معمولی کوششوں سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی نہ ہی آسانی سے ہر کس و ناکس اس منصب کی خلعت اپنے جسم پر موزوں کر سکتا ہے تنقید نگار کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی شاعر یا فنکار پر تحقیق یا تنقید کرنے کے سلسلہ میں پہلے اس کی تخلیقات کا پوری طرح تجزیہ کرے جس میں فن کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور پنہاں رہتا ہے نیز ادب اور زندگی کے جمال کا بھی کوئی نظریہ یا نقطۂ نظر جلوہ گر رہتا ہے اگر وہ اس سے چشم پوشی کرتا ہے تو تحقیق یا تنقید بے رخ اور بے بنیاد ہو کر رہ جاتی ہے۔

تنقید میں اصولوں کی بڑی اہمیت ہے ہر رائے کے پیچھے اگر وہ محض جذباتیت پر مبنی نہ ہو تو شعوری یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی اصول کام کرتا رہتا ہے۔ ذوق اور پسند اختلاف اصولوں کے اتفاق کے باوجود اپنا رنگ دکھا سکتا ہے لیکن اختلاف رائے کو ہر حال میں ذوق و پسند کا نتیجہ سمجھنا پوری طرح صحیح نہیں۔ اکثر اس کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ نقاد ادب کی تخلیق اس کے مقاصد اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے بارے میں کیا اصول رکھتا ہے۔ بعض صورتوں میں نقاد کے خیالات سے اس اصول تنقید کا پتہ چلایا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھی اصول تنقید کی وضاحت کے بغیر خود اس کے خیالات کی صحیح نوعیت واضح نہیں ہو پاتی۔ دوسرے الفاظ میں اگر اصول تنقید سامنے نہ ہوں تو نہ صرف اختلاف رائے کی خلیج کو پُر کرنا مشکل ہوتا ہے بلکہ تنقیدی خیالات کو اچھی طرح سمجھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

تنقید میں اصولوں کی جتنی ضرورت ہے اتنا ہی اصولوں کی تشکیل و تدوین کا کام مشکل ہے کیونکہ اصول تنقید خود ساختہ نہیں ہو سکتے یعنی صرف ذاتی ذوق اور پسند سے ان کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ اسکے لیے ادب کے گہرے اور منضبط مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار ہر دور کے ممتاز چھوٹے بڑے ادیبوں اور مختلف اصناف ادب کے مطالعے کے علاوہ ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کر کے دیکھنے ہی سے ایسے ہمہ گیر اصول تنقید وضع کیئے جا سکتے ہیں جو ماضی و حال بلکہ مستقبل کو بھی جہاں تک ممکن ہے اپنی گرفت میں لے سکیں کسی ادب کی تنقید کے اصول زیادہ تر اسی ادب کی تاریخ روایات اور حدود و امکانات سے اخذ کیئے جا سکتے ہیں دوسری زبانوں کے ادب سے ایسے ہی اصول لیے جا سکتے ہیں جو یا تو مشترک پہلوؤں پر مبنی ہوں یا پھر ایسے آفاقی عناصر پر جو جغرافیائی اور تہذیبی عوامل سے بالاتر ہوں اسی نقطہ نظر کو پیش نظر رکھ کر غالب پر مندرجہ ذیل مضمون قلم بند کیا جا رہا ہے گو کہ غالب پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے اور اس سلسلہ کا بہت ادبی ذخیرہ موجود ہے مگر جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے عنوان کتاب کے تحت اس قسم کا مواد ہنوز مستحسن طور سے مجتمع نہیں کیا جا سکا ہے۔

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اکبر آبادی مولد دلی مسکن المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ وہ خوش مذاق فنکار گذرا ہے جس نے ہندوستان کی اردو، فارسی شاعری اور نثر کو خلعت تجدید عطا کیا۔ اس کا شمار ہندوستانی ادب عالیہ کے چند اہم اور قابل قدر تخلیق کاروں میں ہے۔ اس کی شاعری نے فکر نو کی طرح ڈالی جس میں عجمی روایات کی قلم لگی ہے اپنی مشکل پسندی اور پیچیدہ گوئی کے باوجود سادگی و پرکاری اور بے خودی و ہوشیاری کی بنا پر عالمی ادب کو اظہار و اسلوب کے بیش قیمت اور لائق تقلید نمونے دیتی ہے۔ وہ صرف شاعری و نثر نگاری ہی میں نہیں بلکہ وضع قطع لباس و طعام طرز ماندو بود یہاں تک کہ جینے اور مرنے میں بھی طریقہ عام پر

گامزن ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔

غالب کی نثر نیز اشعار میں بھی قدیم و جدید شعراء کے متعلق کچھ صریح کچھ مبہم آراء ملتی ہیں۔ ان شعراء میں اردو کے شاعر بھی ہیں اور فارسی کے بھی ساتھ ہی نثر نگار وں اور ادبی تحریکوں اور دبستانوں کا تذکرہ بھی ہے۔ ان تمام چیزوں کے لیے مکتوبات کے آئینہ میں اچھا خاصا مواد ملتا ہے جس سے بڑے کارآمد اور اہم نتائج نکلنے کی امید یں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

یوں تو انھوں نے عرفی، ظہوری، بیدل، خسرو، میر و ناسخ وغیرہم کی برتری کا اعتراف جابجا کیا ہے مگر میری دانست میں غالب ہی وہ پہلا شاعر ہے جس نے غزل کو نیے مضامین سے بھر دیا اور فلسفہ و حکمت کا رنگ دے کر گہرائی اور گیرائی بخشی ورنہ غالب کے عہد تک غزل گوئی برابر ایک ہی ڈھرے پر گامزن تھی وہ شعر و سخن کے میدان میں ایک نیے آہنگ کے ساتھ داخل ہوا غزل کو نیا لب و لہجہ اور نیے انداز بیان سے آراستہ و مرصع کیا۔ شاعری میں بے شمار عنوانات ہیں۔ طنز ظرافت کو دیکھیے تو زعفران زار عمیق افکار کا مشاہدہ کیجیے تو بے مثال طرز ادا اور ندرت پر توجہ کیجیے تو ایک جہان نو کی سیر سے لطف اندوز ہو جیے اس کی شاعرانہ عظمت میں گنجایش کلام نہیں۔ اپنی تصنیف درفش کاویانی میں وہ اپنے اعلیٰ مقام کے بارے میں خود رطراز ہے جو آج ہمارے لیے پیشین گوئی کا مرتبہ رکھتی ہے اور ہم بلا تامل اسے دلی کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"روح سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس گزر چکے ہیں اور اب میری عمر چھیاسٹھ کی ہو چکی ہے میں اس نعمت کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ کمالات فن سے نوازنے والے مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے

کھول دیئے ہیں اور میرے فکر دخیال کی کرسی کو معرفت و آگہی کی کسی بلندی پر جگہ دی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہچانا ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کی روشنی بخشنے والے کمالات کہ جن کو میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ لوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے۔"

(ترجمہ عبارت درفش کاویانی بحوالہ مرقع غالب صفحہ ١٩)

مکتوبات بنام

مرزا ہرگوپال تفتہ

بھائی یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے فن تاریخ گوئی میں ان کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں یہ مصرع سلمان ساوجی و ظہیر کا سا ہے چار لفظ اور چار دل واقعے کے مناسب یہ مصرع اور مصرعے کی فکر کرنی کس واسطے؟ واہ واہ سبحان اللہ

اور یہ جو تم کو فر کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سو کھا سہما شعر ظہیری کا لکھا بڑا تعجب ہے یہ لفظ میرے ہاں پنج آہنگ میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا فر اور فرہ لفظ فارسی ہے مرادف جاہ کے پس جاہ کو اور انکو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب کے نہ لکھیے؟ عالی جاہ اور بلند جاہ اور مظفر فر اور فریدوں فر یوں بھی درست اور صرف جاہ اور فر یوں بھی درست۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو خطاب بہادری کہنا بیجا ہے سنو، خطاب کے مراتب میں پہلے تو خانی کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے مثلاً ایک شخص کا نام میر محمد علی یا شیخ محمد علی یا محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی خانی نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہ وقت محمد علی خاں کہہ دے تو گویا اس کو خانی کا خطاب ملا۔ اور جو شخص کہ اس کا اصلی نام محمد علی خاں ہے یا تو وہ قوم افغان سے ہے یا خانی اس کی خاندانی ہے بادشاہ نے اس کو محمد علی خاں بہادر کہا پس یہ خطاب بہادری کا ہے اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں اس سے بڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے یعنی مثلاً محمد علی خاں بہادر اس کو منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر کہا۔ اب یہ خطاب دولگی کا ہوا اس کو بہادری کا خطاب نہیں کہتے اب اس خطاب پر افزائش جنگ کی ہوتی ہے منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر شوکت جنگ۔ ابھی خطاب پورا نہیں۔ پورا جب ہوگا کہ جب "ملک" بھی ہو پس پورے خطاب کو خطاب بہادری لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے ....

(خطوط غالب صفحات [illegible])

تمہارے شعر میں جو تردد تھا اس کا جواب میں نے لکھا ہے تم کو بھی معلوم رہے ؎

رفت آنچہ بہ منصور رشنیدی تو دمن ہم
اے دل سخنے ہست نگہدار زباں را

تردد یہ ہے کہ آنچہ بہ منصور رفت نہیں دیکھا آنچہ بر منصور رفت درست ہے
جواب بائے موحدہ علیٰ کے معنی بھی دیتی ہے پس جو کچھ بر سے مراد تھی وہ بائے موحدہ
سے حاصل ہو گئی اور بائے موحدہ کے معنی معیت کے لیں تو بھی درست ہو نظیری
کہتا ہے ؎

شادی کہ بنبض میکشی دو دم نیسزنی
در شہر ایں معاملہ با ہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں معاملہ ہو اور اس شعر میں معاملہ کا لفظ نہیں جواب اس
کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے نظیری کے ہاں معاملہ مذکور ہے
اور تفتہ کے ہاں مقدر ہے رفت کا صلہ اور تعدیہ بائے موحدہ کے ساتھ دونوں
جگہ ہے ۔ والسلام

اسد اللہ ۱۸۵۱ء

(خطوط غالب صفحات ۱۳/۱۴)

بندہ پرور۔ بیش از بیش وکم از کم یہ ترکیب بہت صحیح ہے اس کو کون منع کرتا ہے اور جلالِ اسیر کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے اسکے معنی یہی ہیں کہ درزمان من بہر بیش از بیش شد و درزمان توودفا کم از کم۔ استاد کہا ہے گا ایسی تو تین ٹکڑے کالف و نشر ہے من اور تو مہر اور دفا بیش از بیش اور کم از کم یاد ہے کہ بیشتر از بیش و کمتر از کم اگرچہ بہ حسب معنی جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔ بیش از بیش وکم از کم افصح ہے وہ شعر تمھارا خوب ہوا اور ہمارا دیکھا ہوا ہے۔

قیس از تو نہ ایم کم دلے صبر　　　بیش است تراکم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر کمتر ہوتا تو اور اچھا تھا بہرحال اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ تر کا لفظ افصح ہے چنانچہ میرا شعر ہے

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم　　　حسن با ایں تابناکی افتاب بیش نیست

ورنہ چشم توجہ از روزن دیوار کم است

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہو فارسیت نہیں رہتی

سہل مشمار زندگی ہا

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کردیا ہے

رائگاں است زندگانی ہا　　　می تواں کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے شراب کے نشے میں لکھا ہے اور اوراق اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب گلہ تاکے زرندگانی ہا" اس کو موقوف کیجیے، اور وہ مطلع رہنے دیجیے کہ وہ بہت خوب ہے بعینہ مولانا ظہوری کا معلوم ہوتا ہے بھائی ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو ہماری محنت تو ضائع نہ جاوے۔

"ایامے چند" میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے مثلاً معنی چند۔ اور احکام چند اور اسرار چند یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں "آمال ہا" یہ کھلی سہرٹ ہو۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈھتے پھریں مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

میری جان! ایسے موقع میں یہ چاہیئے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہیے گا حضرت صائب کو۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی یہ غلط البتہ میرا بھی موجب ملال ہو مگر یہ کون واقعۂ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبان اخبار اس کو چھاپیں آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمایئے۔

گر ماہ و آفتاب بمیرد غمے نیست ٭ ز ہرہ ز تیر دو ہرہ کشتہ شود نوحہ خواں مخواہ

محررہ نہ شنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء (خطوط غالب صفحات ۱۵/۱۶)

صاحب، دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے پہنچا، نہ اصلاح کو جگہ نہ تحریرِ سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے تم نے الگ الگ دو ورقہ پر کیوں نہ لکھا؟ اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا بہر حال اب مجھے پچنے پڑے ہیں سوالات اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا میرا قصور نہ جاننا۔

"بلا رہا ہے" آمیں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے۔ "رہا" اس کا مخفف ہے۔ "خارہا در رہش افشانم کہ چوں خواہد شدن" بہت خوب اور معقول میرا اس وقت خدا جانے کس خیال میں تھا "چوں خواہد شدن" و "کنوں خواہد شدن" ردیف قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ بے پیر تو رانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعر فارسی میں کیونکر اجازت دوں گا؟ میرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔

"شست بستن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیئے یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔ "بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحبِ زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔

زاہداں ایں سخنت ہرزہ کہ گفتی چہ شدی
حق غفورست گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی" "تا چہ" سوال ہو سکتا ہے پھر "گناہے شدہ ام" یہ جواب مہمل۔ گناہے کردہ ام جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے کہ ہمہ تن گناہ نہ ہی سراپا گناہ یا سراسر گناہ شدہ ام۔ یہ جواب اس جواب سے سراسر بے ربط ہے جب تک ہمہ تن گناہ نہ ہو۔ معنی نہیں بنتے ہرگز ہرگز۔ اصلاح دے ہوئے شعر میں مضمون تمھارا ہی رہا اور ٹکسال کے موافق ہو گیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں الجھ کر حقیقت معنی سے غافل رہے۔

بازار دل خود از چنیں کار آزار چہ می کنی دلم را

"اہلی" نے زبردستی کی ہے مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرالی ہے یعنی آزردن مصدر اور آزارد مضارع اور آزاد امر۔ امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد کردن کے ساتھ پاتا ہے، خیر رہنے دو۔

کنداں آہوے وحشی زبرم فردارم

یہ شعر موید میرے کلام کا ہے "برادرم" و زردارم و سردارم و فردارم یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں الفِ ممدوہ کہیں نہیں۔ ہاں۔ بو دارد و رو دارد و فرد دارد تمھارے عقیدے کی تائید کرتا ہے مگر یہ شعر استاد کا نہیں مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاءالدین۔

ما مقیمان کوے دلداریم

یہ ترجیع بند الھیں کا ہے۔ ان کو نقر و فنا و سیر و سلوک میں سمجھنا چاہیے، نہ انداز کلام میں۔

ہر مو راست شمشیرے کہ بر موے میاں دارد

بھائی خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی کی سند نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے۔ کمر مور و تلوار۔ پر مور۔ وجہ تشبیہہ۔ علاقہ پر مور با مور مانند علاقہ شمشیر با میان۔ نزاکت وجہ تشبیہہ کبھی نہیں انصاف شرط ہے۔ تلوار کی خوبی تیزی ہے یا نازکی؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ باندھو۔ خوبیں اور تلوار میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔

میاں "خمیدن" بھی صحیح اور رحمیدن بھی صحیح اس میں کس کو تردد ہے مگر لغت اور محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے باتونی لوگوں کو "خم وچم" بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم ونثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا اچھا کو بھی پسند کر کیا کروں؟ جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا اس کو کیونکر صحیح جانوں؟ چمید صیغہ ماضی کا ہے چمیدن ہے اور چمیدن ایک مصدر ہے۔ صحیح اور مسلّم چمد مضارع چم امر اس میں کیا گفتگو ہے کلام خم وچم میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں خدا کرے مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراق طلسمی کو دیکھو تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا میں بہت گھبراتا ہوں۔

خمیدست و رسیدست میں نزنی دست یہ قافیہ درست ہے مگر است کا الف سب جگہ گرا دو اور یاد رہے کہ صرف سین تے کافی ہے الف ضرور نہیں۔ غالب

(خطوط غالب صفحات ۲۵/۲)

"نظر شگفتن" "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو۔

نظارہ راز خونِ دلم گل در آستیں
خونش مگو بگو کہ ز چشم چمن چکید۔

یہ نہ سمجھنا کہ "چمن از چشم چکیدن" "شگفتن" "گوش و نظر" کے مانند غرابت رکھتا ہے یہ خونفشانی چشم کا استعارہ ہے اور خوں فشانی صفتِ چشم ہو سکتی ہے اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا تو ہم اس کا استعارہ بہ شگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا جب صفتِ چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں؟

یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو نیں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں مگر ہاں ایسی تکرار جیسی بیش اور بیشتر کے باب میں کی تھی ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ کو لکھوں گا تم کو اس کے لکھنے کو کیوں منع کروں گا۔

اے صد ہزار راز نہاں اندریں سخن
گر کم سخن توئی نگہت کم سخن مباد

ہر چہ بانفس خود کنم زبدی
نیکیش نام می توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں رہنے دو۔

شہر ناکامیم سلامت باد
کام را کام می توانم کرد

میں نہیں سمجھا کہ اسکے معنی کیا ہیں۔ کام کو کام سب کر سکتے ہیں۔ اس میں

لطف کیا ہے ؟

زتر کتازی آں نازنیں سوار ہنوز   زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے۔ یہ سقم ہے۔ یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اسکی پیروی نہ کرو۔ بھائی۔ تمھارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو مکینند متمم معنی ہے مکینند زائد نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ کہ اگر فارسی رہنے دو تو اور اگر ہندی کرو تو مصرع مہمل اور بے معنی ہے۔

چہ گل چہ لالہ چہ نسریں چہ نسترن مکینند

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ کیا موتیا کیا چمپیا نہ کرد زنہار نہ کرد یعنی کیا نہ کرو؟ اب جب تمھیں کہو کہ صاحب ذکر نکرد تب کوئی جانے ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ اے تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرد۔ حضرت ذکر مضاف کیونکر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف کہو گے کہ ذکر کا لفظ نہیں بیان کا لفظ اُوپر کے مصرع میں ہے وہ بیان کا لفظ رتنوں سے اور زنجیروں سے ان چاروں لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ کہو ترجیع بند لکھو۔ یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔ والسلام۔ اسد اللہ

(خطوط غالب صفحات ۲۸-۲۹)

صاحب، دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بیش" اور "بیشتر" کا قصّہ نکلا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے۔

جزوِ کلمہ: (مصرع)

ہمائے بر سر مرغان از آں شرف دارد
اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را[1]

یہ ساری غزل اور مثل اسکے جہاں یائے تحتانی ہے جزوِ کلمہ ہے اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے ہمزہ وہاں بھی مخل ہے جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم توصیفی اضافی بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا فدائے تو شوم رہنمائے تو شوم یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی دوسری طرح توحید و تنکیر و مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری آشنائی یہاں ہمزہ ضرور بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور توحیدی آشنائے یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھوگے دانا نہ کہاؤگے۔

نیم گناہ و نیم نگاہ و نیم ناز یہ روزمرۂ اہل زبان ہے۔ نیم بہ معنی اندک ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کا ادھواڑ اور ناز آدھا یہ مہملات میں ہے ان چیزوں کا مناصفہ کیا؟

---

[1] دوسرا مصرع، کہ استخواں خورد و جانور نیازارد (گلستاں باب حکایت ۱۵)

اگر تم کو نیم گناہ پسند نہیں تازہ گناہ رہنے دو۔

خستہ، بستہ، تازہ، غازہ، خانہ، دانہ، آوارہ، بے چارہ، روزہ، بوزہ، ہزار لفظ ہیں کہ اون کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اوس کی علامت کیواسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ زرہ، گرہ، کلاہ، شاہ، آگاہ، آگہ، صبحگاہ، صبحگہ، ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے تو زرہے، گرہے، کلاہے، شاہے، آگاہے، آگہے، گاہے، گہے، لکھ دیتے ہیں۔ غالب

(خطوط غالب صفحات ۲۹-۳۰)

"دیدنست" یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمھارا میں نے سمجھ لیا۔ مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ "المعنی فی بطن القائل" کے یہی معنی ہیں۔

"چشمانِ پُرخمار" و "چشمانِ بے حیا" ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو

ان سب اشعار میں نہ عیب، نہ لطف۔

دیکھو صاحب، خط میں تم پھر وہی "بیش" و "بیشتر" کا قصہ لائے ہو ——

"چہ مجرم" "چہ سبب" و "چہ گناہ" پر جو سند لاتے ہو۔

"عشق است و صد ہزار تمنا، مرا چہ جرم"

اس کی حاجت کیا ہے؟ "جاناں مدد دے"، "یاراں مدد دے" یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی۔ تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا؟۔ دیکھو، رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو، نے دین کو نقصاں مجھ سے
باعثِ دشمنی، اے گبر و مسلماں مجھ سے؟

غالب کہتا ہے: مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں۔ یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ زجدائی ہے بیانی نہیں۔

اگر دریافتی بردانشت بوس۔ وگر غافل شدی، افسوس افسوس

روز جمعہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۵۴ع   از اسداللہ

(خطوط غالب ۳۰/۱۳۱)

جیتے رہو اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسایا وہ کون ملّا تھا جس نے تم کو پڑھایا۔
"گرچہ عملکار خردمند نیست" عملکار۔ اہلکار۔ یہ شعر شیخ سعدی کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے۔ جز بہ خردمند مفرما عمل یعنی خدمت و اعمال سوائے علما اور عقلا کے اور کے تفویض نہ کر پھر خود کہتا ہے۔ گرچہ عمل کار خردمند نیست یعنی اگرچہ خدمات و اشغال سلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطرے میں ڈالے۔ عمل الگ ہے اور کار مضاف ہے بطرف خردمن[illegible] ہی خدا کی عملکار۔ اہلکار کے معنی پر نہیں آتا مگر قتیل اور واقف یا اور پورب کے میبوں کی فارسی۔

اقتباس خط نمبر ۶۱
اُردوئے معلی صفحہ ۵۰
(نیز خطوط غالب صفحہ ۲۵)

صاحب، قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے بھی مجھ کو دی ہے خدا اون کو سلامت رکھے کل مرزا صاحب کے خط میں اون کو ایک مصرع کسی استاد کا لکھ چکا ہوں میں سراسر اون کا ممنون احسان ہوں میرا سلام کہنا اور لفافۂ اخبار کے پہنچنے کی اطلاع دینا میرے نام کا کوئی لفافہ ضایع نہیں جاتا خدا جانے اس پر کیا بجوگ پڑا ظاہرا انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیجا ہوگا پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟۔

شیہہ بمعنی صدائے اسپ، لغت فارسی ہے بہ شین مکسورہ و یائے معروف وہائے ہوز مفتوح وہائے ثانی زدہ اور عربی میں اس کو صہیل کوئی لغت نہیں ہے نہ عربی نہ فارسی اگر غنیمت کے کلام میں صیہہ لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے۔ غنیمت کا کیا گناہ ہے؟

در خود روے ہنر نہ گاہے شمار یافت

اصل مصرع یوں ہے۔ میں نے سہو سے خدا جانے کیونکر لکھ دیا ہے۔ بھائی مہر خواں کے دو معنی ہیں: ایک تو خطاب کہ جو سلاطین امرا کو دیں اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں یعنی عرف۔ حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے جو تمھارے ذکر میں ہے پہلے مہر خواں کے معنی حاشیے پر چڑھ گئے ہیں مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے؟ اور اگر لکھ بھی دو تو قباحت

کیا ہے؟ بھائی صاحب کیوں مغالطہ فرمائیں حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا صاحبان کونسل کی رائے ولایت آگرہ یعنی میرے محکمے میں منظور، مقبول نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو۔

بنام آں کہ او نامے ندارد
بہر نامے کہ خوانی سر بر آرد

(خطوط غالب ۵۵)

صاحب، تمہارا خط آیا میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل حدیقہ میں مرقوم ہے؎

پسرے با پدر بزاری گفت — کہ مرا یار شو بہ ہمراہ جفت
گفت بابا زنا کن و زن نے — پند از خلق گیر و از من نے
در زنا گر بگیرد ت عسسے — بہلد کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی ہر گز ت رہا نکند — در تو بگزارش جہا نکند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے کہیں اور کیوں جاؤ گے بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمہارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک خرچ ہے وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہو اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے؎

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام — زیں ہوسہا گزریا مگز رمی گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش ، نہ مردہ ہوں نہ زندہ ، بجیے جاتا ہوں باتیں کیے جاتا ہوں روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا نہ شکر ہے نہ شکایت جو تقریر ہے بسبیل حکایت ہے بارے جہاں رہو جس طرح رہو ہر ہفتہ میں ایکبار خط لکھا کرو۔ یکشنبہ ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء

(اُردوئے معلی صفحہ ۵۹ نیز خطوط غالب ۶۰/۶۱)

میاں! تمھارے انتقالات ذہن نے مارا میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر داں نہ ہوگا مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں بو علی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضایع اور بے فایدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا دنیا میں نام آور ہوے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم ہے اے یار جانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں عالم بے رنگی میں گذر پاؤں جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے اون کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم ہو گا قطعاتِ تاریخ اگرے میوں بھیجوں پھر تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔

"خالقِ معنی" بہ معنی "معنی آفریں" صحیح اور مسلّم اور جائز لیکن جس طرح اللہ میں مشدد لام کو دو لام کے قایم مقام قرار دیا ہے۔ الٓہ۔ الٰہی میں الف ممدودہ کو دوسرا

الف کیوں کر سمجھیں۔ قیاس کام نہیں آتا۔ اتفاقِ سلف شرط ہے۔ آگی میں جب اور کسی نے دو الف نہیں تو ہم کیونکر مانیں؟۔

ددیم بر وزن جویم غلط۔ ڈُدم ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں تو ڈیم پڑھیں گے اگرچہ لکھیں گے ددیم داؤ کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں ددی درست ہے مگر نہ بہ حذف تحتانی مثل زنی بہ حذف نون بلکہ بطریق قلب بعض ددیم کا ددی ہو گیا۔ کنوے کی تاریخ کو بے تامل بھیجد واور تاریخ وفات کا اور مادّہ سوچ کیں واسطے کہ جب آگی میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا والدعا۔ روز ورود نامہ بلکہ وقت ورود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد یکشنبہ از غالب۔

(خطوط غالب صفحات ۲۷/۱)

بھائی، تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا "بہ ہند آمدندے ز ایراں دیار" آمدندی کی جگہ آمدندے بہ صیغۂ استمرار یکساں بار معلوم ہوا، "رسیدند در ہند ز ایراں دیار" اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی یہ بستین کا بیچارا میں واقع ہوا پھر "رسیدند در ہند" بیجا تمھارا تصرف مستحسن جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔ صاحب، سنبلستان سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ رخ کو "گل" زلف کو "سنبل" فرض کرتے ہیں۔ "سنبلستان" میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کے آٹھویں ہفتے کا دن تیسرے پہر کا وقت ہے میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے ہاترس کے مصنف اور دلی کے نامنصف ہیں۔ روز شنبہ ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء اخر روز۔ از غالب

(خطوط غالب صفحہ ۶۸)

میرزا تفتہ صاحب، اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں پہلے تو یہ کہ "خنجر را" و "گوہر را" کو تم نے از قسم تمنا فرض سمجھا اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں۔

(کلیم) شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را   کہ احتیاج شکر نیست شیر مادر را

یہ غزل شاہجہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے ہند نے اس پر غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں اڑا دو — ؟

ضیاء الدین احمد خاں نام ہے ہندی میں رخشاں تخلص فارسی میں نیر تخلص ——— مانا نیر رخشاں ضیاء الدین احمد خاں۔ دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے یہ نہ کہنا کہ شعرا ممدوح کا نام ننگا لکھ جاتے ہیں۔ وہ بحسب ضرورت شعر ہے جس بحر میں پورا نام نہ آئے اسے شوق سے لکھو۔ جائز، روا، مستحسن۔ جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے اس میں فروگذاشت کیوں کرو؟ دوشنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء

(خطوط غالب صفحہ ۸۰)

صاحب، قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفریں ہے۔ پھر استاد کے قصیدے پر تضمین کیوں کرتے ہو۔ نہ اس کی کچھ حاجت نہ اس میں کوئی افزایش حسن۔ تمھارے ایک ایک شعر کو ایک ایک شعر کے بعد رکھو۔ یا تا کہ مقطع کلام ہو جائے پہلا قصیدہ تمھارا "برآدرم" در آورم کی ردیف کا سست ہے اس کو ہم نے نامنظور کیا مگر نظر ثانی میں جو شعر قابل رکھنے کے ہوں گے وہ لکھ کر تم کو بھیج دیں گے بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تا کہ آیندہ اس پالغز سے احتراز کرو۔ ع

نور سعادت از جبہۂ قاصدم چکد

یہ کیا ترکیب ہے؟ "جبہہ" بروزن چشمہ ہے یعنی دو ہائے ہوز ہیں۔ "جبہۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی؟ "ہر کجا چشمۂ بود شیریں" "چشمہ" کی جگہ چشۂ لکھتے ہو۔ یہ بات ہمیشہ یاد رہے اتنے بڑے مشاق سے ایسی غلطی، بہت تعجب کی بات ہے۔

میاں، (مصرع) برگ دنیا نہ ساز ونیش بود۔ یہ کوئی لغت نہیں۔ ایک لفظ نہیں کہ کسی فرہنگ میں سے نکل آئے۔ یہ طرز تحریر ہے کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا کہاں فارسی داں اور عالم ہے کہ لڑکوں کی طرح بیت بخشی کرے۔ آپ دو جوتیاں لگا دیں ایک جوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔

جمعہ ۴ر اکتوبر ۱۸۶۱ء غالبؔ۔

(خطوط غالب صفحہ ۱۸)

صاحب، یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اس کا تمھیں صلہ دے۔ نواب مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدہ کی رسید آگئی یقین ہے تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ ذرا ہی وہ لاہور آیا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا کیا کہنا ایسا ہے اور ایسا ہے میں چند روز میں وہاں آتا ہوں عندالملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہوں گی۔

ضیاءالدین خاں صاحب کا بھی مقدمہ آج کل فیصل ہوا چاہتا ہے وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے ان کو دیا جائے گا۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔

ازمن فراغ برد بریدم من از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی "قطع نظر کردم از فراغ و نومید شدم از فراغ۔"

(خطوط غالب صفحہ ۸۲)

بھائی، ریمیا اور ہیمیا خرافات ہے اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو، اور افلاطون اور بو علی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ کیمیا اور سیمیا دو علم شریف ہیں جو اشیاء کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ کیمیا۔ اور جو اسماء سے متعلق ہو وہ سیمیا۔

جاں غم سیمیا نخورد گہے　　　دل سوے کیمیا نیاورد دم

شعر بامعنی ہو گیا یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟ زماں و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زماں و زمانہ لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا۔ سمجھو۔ پہلا مصرع لغو دوسرے مصرع میں "بزد" کا فاعل معدوم۔ "حلقہ زدا" کی زے پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصہ میں لکھا کہ "نہ حلقہ را" درست نہ حلقہ زا درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے۔ خیر رہنے دو۔ مرتا ہوں مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہل زبان خواہند یافت" مگر باقی کلام اہل زبان نہیں۔ یہ "گردش چرخ استخواں سائیدہ" اس سے یہ بہتر ہے "سودہ شد استخواں زگردش چرخ۔ باقی اور مصرعے اچھے بنائے ہیں۔ غالب

(خطوط غالب صفحہ ۸۳)

صاحب، دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف۔ ایک فارسی ایک عربی، ہر چند اس منطق میں لغاتِ ترکی بھی آجاتے ہیں۔ مگر کمترین عربی کا عالم نہیں۔ مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں۔ علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلبگار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبداءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں ایک تو یہ کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دو سو، چار سو آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں "جود" لغت عربی ہے۔ بہ معنی بخشش۔ جواد صیغہ ہے صفت مشبہ کا بے تشدید۔ اس وزن پر صیغۂ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھوں گا۔ چونکہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا تو میں نے مانا۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہوئے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ بچپن میں جب ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو نظیری کا دیوان وقت تحریر قصیدہ پیش نظر ہوگا اور جو اس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا اس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمہارے اس خط کے دیکھنے

سے پہلے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ بھی ہے۔ چہ جائے آنکہ وہ شعر۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

زمان لفظ عربی ازمنہ جمع۔ دونوں طرح فارسی میں مستعمل، زمانے، یک زماں، ہر زماں، دریں زماں، درآں زماں، سب صحیح اور فصیح جو اس کو غلط کہے وہ گدھا۔ بلکہ اہل فارس نے مثل "موج" "موجہ" یہاں بھی ہے بڑھا کر زمانہ استعمال کیا ہے۔ یک زماں کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا۔ سعدی کے شعر کے لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو، میاں، میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیٔ فارسی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس اُلّو عبدالواسع ہانسوی لفظ نامراد کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ وشعلہ کدہ، و نشترکدہ اور ہمہ عالم وہمہ جا کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زمان" کو غلط کہوں گا۔؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہات میں ہے۔ للّٰہ الحمد وللّٰہ الشکر۔ مرقومہ چہار شنبہ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۶۳ء

(خطوط غالب صفحات ۸۳/۸۴)

میرزا تفتہ یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ کہ "اعمّ" بہ تشدید لفظ عربی ہے۔ ع دیگر نتواں گفت اخص راکہ اعم ہست۔ مگر بحر ادرہم جاتی ہے مانا کہ فارسی نویسان عجم نے یوں بھی لکھا ہو۔ کاف کے اسقاط کی کیا توجیہ کروگے؟ اور پھر اس صورت میں بھی توجہ بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال ڈالو۔ میں نے تمھیں قصاید لکھنے کو کہا تھا اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو مدح بہ شرط ضرورت لکھو مگر بہ فکر و غور

۱۶ر جولائی ۱۸۶۳ء غالب

(خطوط غالب صفحات ۸۸/۸۹)

سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بر دے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا؟

بہ ازین نصیحت گرے باید ت　　ندانم پس از من چہ پیش آید ت

میں نے جو لکھا کہ اچھا ہوں اس کو آپ (سچ) سمجھ کر خدا کا شکر بجا لایے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدت مرض کا بیان مبالغۂ شاعرانہ ہے اس کو بھی اپنے سچ جانا ہو گا حال آنکہ یہ دونوں کلمے از راہ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹ کو ملعون جانتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیان واقعی کو باور نہ کیا تو میں نے تمہیں لکھ بھیجا کہ میں اچھا ہوں۔ اور یہ کلمہ نہیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اور ہاتھ میں جنبش قلم ہے جب تک موقع اصلاح خیال میں آسکتا ہو آج جو تمہارا دفتر پہنچے گا اس کو کل روانا کر دیا کروں گا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتوں میں پھوڑے پانؤں میں درم نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے بیٹھ نہیں سکتا۔ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمہارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمہیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ دفتر کے دفتر بھیجتے رہو۔ ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا قریب مرگ ہوں تو بلا سے۔ غالب پنجشنبہ

۲۳ رجولائی ۱۸۶۳ء

(خطوط غالب صفحہ ۸۹)

انگشتری اور خاتم دونوں ایک ہیں تم نے خاتم بہ معنی نگین باندھا ہے یہ غلط "جنس دفاکس مخر" کیا ترکیب ہے؟ "جنس کس مخر دفا" البتہ درست ہے۔ نظر اول میں یہ سبب تکرر حواس اور کثرت درد و درم یا کے میں نے خیال نہ کیا ہوگا۔
یہ خط لکھ کر بند (کر) رکھا تھا کہ کل صبح روانا کردوں گا چشم بد دور آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے آپ کا نوازش نامہ پہنچا وہ سرا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے اس کو کتر کر یہ سطریں لکھ کر پھر بند کرتا ہوں۔ سبحان اللہ۔ "دیگر نتواں گفت انحص راکہ اعم ست" ایں اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو؟ غور کرو بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کروگے۔ شرف قزوینی کے مطلع میں "ساغر غم درکشیدہ ایم" و "دم کشیدہ ایم" دوسرے شعر میں "پیمانہائے زہر ستم درکشیدہ ایم" درکشیدن کو ربط پیمانہ کے ساتھ ہے یا زہر کے ساتھ؟ اگر زہر کشیدن جائز ہوتا تو وہ "سم" کے قافیہ کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں "قلم درکشیدن" ہے چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے پانچویں میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بہ شکل آب ہوتا تو روا تھا۔ سبحان اللہ یہ عبارت جائیکہ شرف قزوینی ساغر و پیمانہ و زہر درکشید" اے برادر! شرف زہر کجا درکشید؟ بلکہ پیمانۂ زہر درکشید۔ شما ہم ساغر سم درکشید۔ سم درکشیدن کجا۔ ہم نے تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو۔ ہند میں اس کو کون سمجھے گا؟ چاہو اس کو یوں کردو۔

دانی من و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم   در یک نفس دو ساغر سم درکشیدہ ایم (غالب)

سبحان اللہ۔ تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟ ؎

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست (غالب)

خیر، شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو۔

میں ایسا جانتا ہوں کہ "ذرّاعہ" بہ تشدید ہے اور وہ "درع" بہ وزن "زرع" اور لغت ہے۔ صاحب یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے۔ ایک خیال رکھا کرو کہ شعر آخر میں کوئی بات ایسی آجایے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دیکر بھیج چکا ہوں اور اوسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں اودھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے تو گھبرایا نہ کرو اب میرے پاس دو قصیدے ہیں ایک "دل شکر بر آورد دم" اور ایک کل آیا ہے۔ "برجا ماند" و "دریا ماند"۔ خوب کہے کہ مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ اگر میں تم کو ممدوح بنا سکتا تو قصیدہ اوس کے نام کا تم سے منگوا چکا ہوتا اور اوس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی، ایک دقیقہ ہے کہ لکھنے کے قابل نہیں۔ ہاں ملاقات ہونے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ اللہ!۔

(خطوط غالب صفحات ۷۸)

صاحب، "کشیدن" کی جگہ درکشیدن و برکشیدن بلکہ برکشیدن کی جگہ درکشیدن نہ چاہیئے۔ "برآمدن" و "درآمدن" کا استعمال بعض متاخرین نے عام کردیا ہے یعنی "درآید" سے "برآید" کے معنی لیے ہیں لیکن درکشیدن اور ہے اور کشیدن اور۔ میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پانو میں ورم نے اور ہات کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرنا اور میرے سب آدمی بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے سب کو منع کردیا ایک رئیس رامپور اور ایک تم۔ ان کی اصلاح رہ گئی۔

(خطوطِ غالب صفحات ۸۹-۹۰)

صاحب، واقعی "سداب" کا ذکر کتب طبی میں ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمھارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا اس واسطے کاٹ دیا۔ "قراب" کون سا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح سے پوچھتے ہو خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ قراب اور سداب دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔ غالب

(خطوط غالب صفحہ ۹۴)

حضرت، اِس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بت خانہ تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ، چونکہ ایک علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مختص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیہ اصلی سمجھ لیجیے باقی غلامانہ و مستانہ، و مردانہ و ترکانہ و دلیرانہ و شکرانہ سب ناجائز و نامستحسن۔ ایطا، اور ایطا بھی قبیح مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوانی پر رکھی۔ کاشانہ و شانہ و افسانہ و جانانہ و فرزانہ یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے ساری غزل میں مردانہ یا مستانہ یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے دوسری بیت میں زنہار نہ آوے یہ غزل نظری ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تا اصلاح دی جائے۔ عفو کا طالب غالبؔ۔

(خطوطِ غالب صفحات ۹۴/۹۵)

مرزا تفتہ۔ پیر شود بیاموز ـــــــ تم خوش گو، اور زود گو مقرر ہو لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو وہ قیاس کہیں مطابق ہوتا ہے کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے۔ع روح را ناشتا فرستادی۔
یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔ ناشتا اوس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اوس کی نہار منہ تم لکھتے ہو۔ع کہ عجب ناشتا فرستادی۔ یعنی غذاے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے "اس نے ناشتا بھی کیا ہے کہ نہیں۔"؟

واقف کہتا ہے ؎

نے محرم قفس نہ بہ دام آشنا شدیم نفریں کنیم ساعتِ پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے۔ "بری گھڑی" اور "صبح گھڑی" اہلِ زبان ایسے موقع پر طالع لکھتے ہیں۔ع:

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

تپش کہتا ہے ؎

یک دجب جائے بکوے تو زخوں پاک نبود کشتہ بر کشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

یہاں ہیچ نبود کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں اور پھر صاحبِ برہان قاطع کا کیا ذکر کرتے ہو؟ وہ تو ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے۔ زیر زبر پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا

ہے جس لغت کو کاف عربی سے لکھے گا کاف فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طائے حطی سے لائے گا تائے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ فضلائے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اس کی کیا تحمیق کرتے ہیں "بنیا" بنوت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ "امامن" امام کے مشتقات میں سے زنہار نہیں۔ "نبی بخش" کا مخفف "بنیا"۔ اگر امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو امامی اور اگر مؤنث ہے تو امامن۔ طغرا نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے ع وقت ان آمد کہ مینا راگ ہندی سر کند۔

اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں مگر کیا کریں۔ گڑگانواں نام ہے ایک گانو کا اس کو کیونکر بدلیں؟ ہاں اگر "گرو" بہ رائے قرشت کہیں گے۔ "لکھنؤ" نام ہے ایک شہر کا وہ "لکھنؤ" بغیر ہا سے مخلوطہ کے کہیں گے۔ فی زمانا چھاپے کو چاپ بولتے ہیں۔ عرفی "جھگڑ" کو "جکر" بولتا ہے ع آں بادکہ در ہند گر آید جگر آید۔

رائے ثقیلہ، ہائے مخلوطہ، تشدید۔ یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب "برہان قاطع" اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے۔

ہرزہ شتابی پے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں ملتا۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں گائے کا بچہ بہ زورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو۔ دو باتیں سنو! ایک تو یہ کہ ارغنوں کو بہ غین مفہوم میں نے سہو سے

لکھا۔ دراصل ارغنوں بہ غین مفتوح اور مخفف اس کا ارغن اور مبدل منہ "ارگن" ہے۔ دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے "ایواسے" کو "ایوا" لکھا تو لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

یکشنبہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء۔ نجات کا طالب غالب۔

(خطوط غالب صفحات ۹۵/۹۶)

صاحب، تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔ تن تن اور تنتنا اموات ہیں تار کے۔ ہندی و فارسی میں مشترک "بنیا" اور "امان" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں کیا۔ شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "بنیا" مخفف نبی بخش اور امان متعلق بہ امام ہے۔ مشتقات میں سے اس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ و اذان اشتقاق تم پر ہنسیں گے۔

ایوائے کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں سب مانع ہیں۔ "ایوائے" کے اور سند "ایوائے" کی موسوی خاں نے بہ سبب ضرورت شعر "ایوا" لکھا ہے "تہمتن" بروزن "قلمزن" ہے فردوسی نے سو جگہ شاہنامے میں تہمتن بہ سکون ہائے ہوز لکھا ہے پس کیا اس لغت کی دو صورتیں قرار پا گئیں؟ لاحول ولا قوۃ! لغت وہی بہ حرکت ہائے ہوز ہے۔

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا۔ صائب کے شعر کی حقیقت شرح و بسط سے لکھی تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ ایوا کو الگ سمجھے۔ "مصیبتا" کو جدا سمجھے۔ بھلا میرے قول کو گوز شتر سمجھتے ہو۔ ذرا "مصیبتاہ" یا "حسرتاہ" برہان قاطع میں یا "بہار عجم" میں ہم کو دکھا دو۔ وہی وائے ہے کہ جب اس کے بعد مصیبتا یا حسرتا یا دیلا آتا ہے تو تحتانی کو حذف کر کے وادیلا وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو وائے وادیلا لکھو، چاہو وادیلا لکھو چاہو آخر میں ہائے ہوز لکھو جیسا کہ "امصیبتاہ" چاہو بے ہائے ہوز وامصیبتا اور یہی حال "حسرت" و

"درد" و "اسف" و "دریغ" "کارجہاں" "اے" کے ساتھ نہ امصیبتا پاؤ وہاں اے کو حرفِ ندا اور منادی یعنی ہمنشیں اور ہمدم کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ لکھنے والوں نے اشعار قدما میں ترکیبیں دیکھیں اپنا قیاس دوڑا کر اس کی حقیقت ٹھہرالی کہیں اون کا قیاس غلط کہیں صحیح سوا اون میں یہ دکنی ایک کج فہم ہے کہ اس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خاں کے شعر کی سند پر "ایوا" کو رہنے دو مگر صائب کے شعر میں ایوا کو الگ اور مصیبتاہ کو جدا نہ سمجھو تمہارے قیاس نے پھر تمہیں کہیں کا تمہیں کھینچا اور تم نے بھی کہا کہ صائب نے ایوا لکھا ہے۔ نجات کا طالب غالب

(خطوط غالب صفحات ۹۷/۹۸)

دل لیسے داغ داد بودہ نماند   در نظر ہا بہار بودہ نماند

اگر بودکے آگے کے واؤ کو موقوف اور محذوف کردو گے تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائے گا۔

میری جان جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے شاید بہ سبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہوگی اور بہ سبب خلاف شرع کرنے کے پیمبر سے بھی نہ ہوگی مگر خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہے۔ مرگ ناگاہ کا طالب غالب

(خطوط غالب صفحہ ۹۸)

فن تاریخ کو دون مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہو جاتا ہے بہرحال میں نے منشی نبی بخش حقیر مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا منشی قمرالدین خاں صاحب نے ناپسند کیا قطعہ یہ ہے ؎

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق
داشت مذاق سخن و فہم تیز

مرگ ستم پیشہ امانش نہ داد
کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز

سال وفاتش زپے یادگار
بادل زار و مژہ دجلہ ریز

خواستم از غالب آشفتہ سر
گفت مدہ طول بگو ستخیز

ایک قاعدہ یہ ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں۔ بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے جیسا کہ یہ مصرع۔ در سال ہر کہ مانند بیند۔ انوری کے قصائد کو دیکھو دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ

"رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر موقع کے مناسب۔ اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب ادائے حق مودت ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں۔ داد کا طالب غالبؔ۔

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۷)

مکتوب بنام

منشی نبی بخش حقیرؔ

مسکیں نہ دیدۂ ز مغاں شیوہ بانواں در خواب گاہ بہمن و دارا گریستن

مغاں شیوہ بانواں۔ بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف نون جمع کا ہے یعنی بیبیاں مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل درخسار اور ماہ جبیں کی ترکیب ہی یعنی وہ شخص کہ جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی اور شیوہ مغاں کا یا ہی مغ آتش کدہ کا کارفرما اور چونکہ پادشاہان پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کی عمائد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے اور شراب کو چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک و متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے یہ بھی مغوں کی تحویل میں رہتی تھی۔ تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں اس کو بقدر مناسب دیں بہرحال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، عالم، فاضل، طرحدار بذلہ گو، حریف ظریف ہوا کرتے تھے اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مغوں کے اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہی کہ جیسے کسی بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔ قصہ مختصر مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں کہ جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو۔ مغاں شیوۂ بانواں مغاں شیوہ دلبراں۔ مغاں شیوہ شاہداں۔ خواہی بہ جمع خواہی بہ انفراد ترکیب مقلوب ہے یعنی بانوے مغاں شیوہ یا بانوانِ مغاں شیوہ قیس علیٰ ہذا اور الفاظ مدح جناب

سید الشہدا میں قطعہ ہے ؎

معذوری از حادثہ رنجی از آں کہ نیست   از نازکی بہ طبع گوارا گریستن
مسکیں نہ دیدۂ زمغاں شیوہ بانواں   در خوابگاہ بہمن و دارا گریستن

حاصل معنی یہ کہ شاعر اپنے نفس کو یا کسو اور کو مخاطب کر کر کہتا ہے کہ تو معاف ہے اگر وقایع حوادث دہر سے آزردہ ہوتا ہے اس واسطے کہ تو بہت نازک ہے اور گریہ وزاری کی شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا یہ بیان بہ سبیل طعنہ و تعریض واقع ہے جیسا کہ دوسری بیت میں کہتا ہے کہ اے شخص تو نے خواب گاہ بہمن و دارا میں پریزاد و نازک دماغاں شیوہ بیگمات کو روتے پیٹتے نہیں دیکھا کہ کیسے پادشاہانِ جلیل القدر کی بیبیاں تھیں اور کیسی طرحدار نازک مزاج کہ جیسے مغ ہوتے ہیں اور پھر ان پر کیا مصیبتیں گذریں۔ ظاہرا تو نے یہ قصہ کتب تواریخ میں نہیں دیکھا اور وجہ بہمن و دارا کے نام خاص کی یہ ہے کہ بہمن ابن اسفندیار کو آغاز شباب میں اژدہا نگل گیا اور دارا ابن داراب ابن بہمن عین جوانی میں سکندر کی لڑائی میں اپنے دو مصاحبوں کے ساتھ مارا گیا۔ والسلام والاکرام نگاشتہ

یکشنبہ   اسد اللہ چارم جون ۱۸۴۷ء

(اقتباس خطوط غالب صفحات ۱۰۲-۱۰۳)

بھائی صاحب یہ عنایت نامہ بھی پایا اور جس کی مجھے فکر تھی وہ بھی آیا ڈاک کا مدار ہرکاروں کی طبیعت پر ہے۔ حال منشی عبداللطیف اور ذکیہ معلوم ہوا گرمی کا موسم ہی میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا کبھی کبھی شربت نیلوفر شربت بنفشہ، عرق نعناع کی سکنجبین، عرق کاسنی، عرق بادیان اسی طرح کی چیزیں گھر میں تیار کر کے گاہ گاہ استعمال میں آتی رہیں ہاں صاحب نصیر الدین کا ذکر اپنے خط میں بہت دنوں سے نہیں لکھا مگر وہ بھی کہیں ہمارے شیخ اکرام الدین کے ساتھ آگرے چلا گیا۔

آپ کی کتاب کی فکر میں ہوں اگر اجل امان دیتی ہے تو اب لکھ کر بھیجے دیتا ہوں ہمایوں کا حال پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو میں آیا ہے اب ایک بات تم کو معلوم رہے کہ جب حضور میں جاتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں سو وہ کہی ہوئی غزلیں کیا پڑھوں نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھیں گا تم کو بھی لکھتا ہوں کہ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے
ہوں کشمکش نزع میں ہاں جذب محبت — کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم — آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین — ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اس سے کہ مجھ کو بھی ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

نوٹ:۔ خط کے متن میں اگرچہ ایک غزل کا تذکرہ ہے مگر مکتوب میں دو غزلیں مندرج ہیں دوسری غزل ذیل میں درج کی جاتی ہے ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل — اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے — کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا — ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے — تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے — کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(خطوطِ غالب صفحات ۱۰۸ تا ۱۰۹)

مکتوب ستمبر ۱۸۵۱ء بھائی صاحب آپ کا خط بہت دن کے بعد آیا خیر و عافیت معلوم ہوئی دل خوش ہوا اب ہوا سرد ہو گئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ شیخ اکرام الدین بھی مع الخیر آجاویں گے آپکے خط کا جواب جو دیر میں لکھا ہو اس سبب سے لکھا ہے تقریب عید قریب آ گئی تھی قصیدے کی فکر میں سرگرداں تھا اب کے عید ہو چکی قصیدہ پڑھ چکا اب جواب آپکے خط کا لکھا کہو گے قصیدہ کیوں نہیں بھیجا بہتر شعر ہیں اور صرف میں لکھنے والا یہ لکھنا فکر شعر سے کم نہیں انشاء اللہ لکھوں گا اور بھیج دوں گا تحریر تاریخ اسی سبب سے ملتوی رہی اب اس طرف متوجہ ہوں گا آپکے واسطے لکھواتا ہوں کاتب کے آگے کار ضروری فرمائش سے حاکم کی آگیا ہے اس کو وہ تمام کرے تب اس تحریر کی طرف توجہ کرے آپ خاطر جمع رکھیں جب تک آپکے پاس نہ پہونچ لے اور آپ اس کو دیکھ نہ لیں تب تک خود میرا دل خوش نہ ہوگا۔

ع وائے بر جان سخن گر بہ سخن داں نہ رسد۔

تاریخ کا حال کیا پوچھتے ہو صرف ہمایوں کا حال لکھ چکا ہوں اکبر بادشاہ کا احوال شروع بھی نہیں ہوا ہے بھائی مجھ سے یہ درد سر ہو نہیں سکتا بس یہ اتنا ہی رہا ایک کاتب ہیں بہت خوش نویس اور صحیح نویس ان کو میں نے مسودے دے اور ان سے کہا کہ اسکی دو نقلیں مجھ کو کر دو۔ ایک تمہارے واسطے اور ایک جانی بانکے لال کے واسطے وہ ایک لکھ لائے میں نے وہ جانی جی کو بھیج دی خیال کیا کہ بھائی کو دس

روز کے بعد بھیجدوں گا ناگاہ کاتب کو ایک کتاب تاریخ کی سشن جج نے لکھنے کو دی وہ لکھ رہے ہیں اس سبب سے درنگ ہو گئی ہو آپ گھبرائیں نہیں ؎

جاروب لا بیار کہ ایں شرک فی الوجود
باگرد فرش وسینہ بہ ایواں برابر است

ترکیب الفاظ یوں ہے کہ شرک فی الوجود باگرد فرش برابر است و سینہ بہ ایواں برابر است یعنی دل بہ منزلہ ایوان کے ہے اور شرک فی الوجود بمنزل گرد فرش کے ہے اس گرد فرش کو جھاڑا چاہیے گرد جھاڑتے ہیں جھاڑو سے لا نافیہ کو جھاڑو مقرر کیا خلاصہ یہ ہے کہ لا نافیہ کی جھاڑو لا اور دل کے ایوان سے شرک فی الوجود کی گرد جھاڑ ڈال اب سمجھئے کہ شرک فی الوجود کیا اور لا نافیہ کیا شرک کئی قسم پر ہے شرک فی الصفات، شرک فی الافعال ان شرکوں کو سب جانتے ہیں مگر شرک فی الوجود بہت پوشیدہ ہے اور سب اس میں مبتلا ہیں یعنی اشیاء کے واسطے وجود جداگانہ قرار دینا اور خلق اور خالق کو الگ الگ سمجھنا مذہب وحدت وجود کا یہ ہے کہ موجود حقیقی حق ہے اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ لا واسطے نفی کے ہے اہل ظاہر لا الہ الا اللہ کو یوں سمجھتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت کے نہیں پس وہ نفی استحقاق عبادت کرتے ہیں اور صوفیہ کہتے ہیں کہ نہیں کوئی موجود سوائے اللہ کے پس یہ لوگ اشیاء کی موجودیت کے عقیدہ کو شرک فی الوجود کہتے ہیں اور اہل ظاہر شرک خفی جانتے ہیں ؎

بالائے طفل یک شبہ در خم زراستی
باقامت خمیدۂ پیراں برابر است

خیال میں ہو گا کہ یہ شعر منجملہ ان اشعار کے ہے جو ماہ نو کی تشبیہ میں واقع ہوئے ہیں ایک تشبیہ یہ بھی ہے طفل یک شبہ پہلی رات کا چاند بالا یہاں بہ معنی قد کے ہے نہ کہ بہ معنی اوپر کے راستی بہ معنی سچ کے ہے نہ بہ معنی سیدھے کے ؎

بر دست شاہ تیغ و کماں راست جایگاہ
با تیغ و با کماں بہ چہ برہاں برابراست

واہ بھائی تم اور اس شعر کے معنی مجھ سے پوچھو یہ دو تشبیہیں ماہ نو کی ہیں تلوار اور کمان شاعر کہتا ہے کہ تلوار اور کمان بادشاہ کے ہاتھ میں ہوا کرتی ہو اور یہ ظاہر ہو کہ ہلال بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں پھر کس برہان سے اور کس دلیل سے شعرا اس کو تلوار اور کمان کے برابر جانتے ہیں ۔

دانم نہ تیغ مصقلۂ تیغ پادشاست
نشگفت گر بہ تیغ بدیں ساں برابراست

یہ بیت متعلق پہلی بیت کے ہے پہلے شعر میں اپنے ایک شبہ وارد کیا کہ تلوار بادشاہ کے ہاتھ میں چاہیے اور ہلال وہاں نہیں ہو بس اسکو تلوار کیونکر کہئے اب آپ ہی مجیب ہوتا ہوں کہ ہاں میں بھی جانتا ہوں کہ یہ تلوار نہیں بادشاہ کی تلوار کا مصقلہ ہے اور عجب نہیں کہ بادشاہ کی تلوار کا مصقلہ تلوار کے برابر گنا جاوے ہاں یہ پوچھیے کہ مصقلہ کیا؟ مصقلہ آلہ ہے تلوار صیقل کرنے کا اور وہ ایک جیسے ہے لوہے کی گھوڑے کے نعل کی صورت ۔

تیغ مرا اگرچہ بود خفتہ در نیام
پولاد با بدخش بدخشاں برابراست

بدخش فارسی میں اسم ہے یاقوت کا اور یہ جو شہر کا نام بدخشاں ہے اسی سبب سے ہو کہ وہاں یاقوت کی کان ہے ۔ تیغ مرا ۔ یہ جو را ہے یہ اضافت کے معنی دیتا ہے یعنی میری تلوار کی فولاد یعنی لوہا اگرچہ تلوار میان میں ہو لیکن یاقوت کے برابر ہے یعنی سرخ ۔ اگرچہ تلوار نہ کھینچوں اور کسی کو نہ ماروں تو بھی میری تلوار خون آلودہ ہے اور مانند یاقوت کے سرخ ہے خالق نے اسکی سرشت میں یہ صفت ودیعت رکھی ہے ۔ والسلام والاکرام غالب شنبہ ششم

(خطوط غالب صفحات ۱۱۴ ، ۱۱۳)

بھائی صاحب آپ کے دو خط آئے پہلے میں خط میں آپ نے ایک بیت کے معنی پوچھے ہیں وہ سنیئے ؎

تو گوئی مگر مہر زیر زمیں فروزاں فوہ بود پشت نگیں

یہ شب معراج کی توصیف میں ہے۔ کہ وہ شب ایسی روشن تھی کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی کہ جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا۔ فوہ فارسی لغت ہے بہ معنی ڈانک۔

(اقتباس خطوط غالب صفحات ۱۱۹/۱۲۰)

۲۸ اپریل ۱۸۵۳ء

بھائی! یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر مہینے میں دو بار شاعرہ ہوتا ہے پندرھویں کو انتیسویں کو حضور فارسی کا ایک مصرعہ اور ریختہ کا مصرعہ طرح کرتے ہیں اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو مشاعرہ ہوا اس میں فارسی مصرعہ یہ تھا۔ ع

زیں تماشا گاہ گریاں می رود

ریختہ کا مصرعہ یہ تھا۔ خمار عشق ہیں کسقدر ہے کیا کہیے ـــــ میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں ایک اور صورت نکال کر لکھا وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں پڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا دینا بچوں کو دعا کہہ دینا تمھارا دوسرا خط معہ رقعہ ملفوفہ پہونچ گیا ہے والسلام والاکرام ۵

چاک از جیب بہ داماں می رود تا چہ بر خاک از گریباں می رود

یعنی میرے جیب کا چاک دامن تک چلا گیا اب دیکھئے گریبان کے چاک پر کیا گذرتی ہے۔ ۵

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار چوں رود از دست آساں می رود

اے دل اگر کوئی کام مشکل ہو تو اس کا رنج نہ کر کیونکہ وہ مشکل ہو کر ہی انسان ہو جاتا ہو ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خبر سخن کفرے و ایمانے کجاست خود سخن در کفر و ایماں می رود

کفر و ایماں سو لئے کہنے کی باتوں کے اور کیا چیزیں ہیں کفر و ایمان میں بھی جائے سخن باقی ہے ~

ہر شمیمے را مشامے در خور ست　　بوے پیراہن بہ کنعاں می رود

ہر خوشبو کے لیے دماغ چاہیے یعنی ایسا دماغ ہونا چاہیے جو خوشبو سونگھ سکے کیونکہ پیراہن کی خوشبو کنعان تک پہونچ جاتی ہے ~

آید از ذوق نشانم کہ کیست　　تا رود بیند آشتی جاں می رود

جب ان کا خیال آتا ہے تو ذوق کی وجہ سے یہ بھی نہیں تمیز کر سکتا کہ کس کا خیال آیا ہے اور جب وہ خیال چلا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جان چلی گئی ہے ~

می برد ما را نہ تنہا می برد　　می رود ما پریشاں می رود

ان کا خیال صرف ایک جگہ نہیں بلکہ جگہ جگہ لے جاتا ہے اور جب جاتا ہے تو پریشان کر جاتا ہے ~

ہر کہ بیند در رہش گوید ہمے　　قبلۂ آتش پرستاں می رود

جو کوئی انھیں راستہ میں دیکھتا ہے کہتا ہے کہ قبلۂ آتش پرستاں تشریف لیے جا رہے ہیں ~

اول ماہ است و از شرم تو ماہ　　آخر شب از شبستاں می رود

چاند اوائل ماہ قمری میں تیری شرم سے آخر شب کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے مقابل نہیں رہ سکتا ہے ~

بگزر از دشمن دلش سخت است سخت　　آبروے تیر و پیکاں می رود

دشمن کو چھوڑ دے کیونکہ اس کا دل سخت سے سخت ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے تیر و پیکاں کی آبرو جاتی ہے ~

کیست تا گوید بداں ایواں نشیں

آنچہ بر غالب ز درباں می رود

کوئی ہے جو اس ایواں نشیں کو بتلائے کہ غالب پر اسکے دربان کے ہاتھوں کیا گذرتی ہے ؎

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے
رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال کہ یہ کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہیے
تمھیں نہیں ہے سر رشتۂ و کا خیال ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے
انھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجیے ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

کہا یہ کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اسکے نہ مدعی بنیے جو ناسزا کہے اسکو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیے کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیے
کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجیے کبھی شکایت صبر گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہ ہو نگاہ میں الفت نہ ہو نگار تو ہے روانئ روش و مستئ ادا کہیے

نہ ہو بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے   طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

(خطوطِ غالب صفحات ۱۲۵/۱۲۶)

نوٹ :۔ فارسی اشعار کا ترجمہ اصل مکتوب میں نہیں ہے۔   (۱۸۵۳)

بھائی صاحب بڑا تعجب ہے کہ تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو۔

اول ماہ است از شرم تو ماہ
آخر شب از شبستاں می رود

اول ماہ یہاں بمعنی مہینے کے ہے اور اول سے ۸، ۹، ۱۰ تاریخ مقصود ہے، اول راتوں میں آدھی رات کے چاند چھپ جاتا ہے پس شاعر کہتا ہے کہ ہنوز ابتدائے حال ہے اور قمر زاید النور ہے اور باوجود اس روز افزونی دولت کے تیری شرم سے آخر شب کو بھاگ جاتا ہے اور تمام رات تیرے مقابل نہیں رہ سکتا اسکو حسن تعلیل کہتے ہیں یعنی چاند کا اوائل ماہ قمری میں آخر شب غروب ہونا ضروری ہے شاعر نے اسکی ایک اور وجہ قرار دی ہے فقط۔ ۲۳ اپریل ۱۸۵۳ء۔

(اقتباس خطوط غالب صفحہ ۱۲۷)

بھائی صاحب الحمدللہ کہ اور تو سب طرح خیر و عافیت ہے مگر گرمی کی وہ شدت ہے کہ عیاذاً باللہ۔ میں آپ احتراق کا مارا دوسرے یہ مصیبت کا کھانا کھانے والا وہ اب موقوف غذا منحصر دہی پر ہے کہاں تک دہی کھاؤں کیا کروں اگرچہ تاب روزہ رکھنے کی کہاں مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں روزہ داروں کو کیا کہوں کیا حال ہے میرے چار خدمت گزار ہیں چاروں روزہ دار آخر روز مجھ کو یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں یہ پریشانی اور بے سروسامانی نہ خس خانہ نہ برف آب سے

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
سامان خور خواب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالب
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

افطار صوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہی روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

یہ رباعی اور قطعہ کی حضور میں پڑھا تھا بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔ جمعہ ۱۴ جون سنہ ۱۸۵۴ء

اسداللہ

 (خطوط غالب صفحہ ۱۳۹)

بھائی صاحب، یہ جو آپ نے لکھا کہ تیرے وہ اشعار سنے جاتے ہیں کہ جو کبھی سنے تھے حال، یہ ہے کہ میں نے ان دنوں میں دو غزلیں لکھی ہیں ایک تو دریا نہ ہوا صحرا نہ ہوا سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں دوسری غزل رواں کیوں ہوا اور گماں کیوں تھے وہ اب بھیجتا ہوں ان دو غزلوں کے علاوہ حال میں کوئی غزل نہیں کہی ہے اگر اس کے سوا کوئی کچھ آپ کے سامنے پڑھے تو میرا کلام نہ ہوگا یا سابق کی کوئی ایسی غزل ہوگی کہ وہ آگے آپ نے نہ سنی ہوگی بندہ پرور رہ روزوں کا اجر جو آپ نے مجھ کو دیا وہ فوراً میں نے الٹا پھیر دیا نہ آم ہے کہ کھاؤں نہ شربت ہے کہ پیوں۔

بھائی آپ کے تہنیت عید میں دو قصیدے کس انداز کے لکھے ہیں کہ دیکھو گے تو خط اٹھاؤ گے پرسوں یا اترسوں روانہ کروں گا ہرگوپال صاحب کو بھی دکھا دیجیے گا۔
رسالدار کے گھر کے باب میں جو کچھ تم نے کہا وہ مطابق واقعہ نہیں ہے یعنی اس نیک بخت نے ضد سے یہ کام نہیں کیا ع این حکایت را بیانے دیگر است۔ ایک زن مرد افگن بدروش بدفن نے اس کو لوٹا کھایا۔ مہمان داری ہر روز و گل و میوہ و نقش و نگار، رنگ و بو۔

یہ عیاشی و بدمعاشی ہے نہ آزردگی و دل آزری ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہو جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہو
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہو کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(اقتباس خطوط غالب صفحات ۱۴۱/۱۴۲)

بھائی صاحب قصیدہ مدحیہ حضرت ولی عہد بہادر میں شین کی ضمیر مطلع سے لے کر بہ طرف معشوق کے راجع ہے ؎

زہے بتانِ مغاں شیوہ داد خواہانش   ز دست ہائے حنا بستہ گل بدامانش

زہے کا مورد مذکور نہیں۔ یعنی معشوق۔ شاعر کہتا ہے واہ عجب معشوق ہے کہ بتانِ مغاں شیوہ داد خواہ اس کے ہیں۔ مغاں شیوہ صفت ہے بتاں کی۔ مرے معشوق کے داد خواہ ہیں ایسے معشوق کہ جو مغاں شیوہ ہیں اور مغوں کی جہاں اور روشیں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھوں میں مہندی لگائے رہتے ہیں اور معشوق کے ہاتھ بھی حنائی ہوتے ہیں اور داد خواہ کا کام دامن پکڑنا ہے جب معشوق اسکے دامن گیر ہوئے اور ہاتھ ان کے حنائی ہیں تو گویا دست ہائے رنگین پھول ہیں اس کے دامن میں۔ الحاصل اس بیت کے ع۔

کے زہر بدل جا گزیدہ پیکانش

شین کی ضمیر بطرف معشوق راجع ہے باقی اور اشعار میں اور طرف ہے کہ قرینہ اس پر دال ہے

تم کس ریختے کو نیا سمجھتے ہو، کہاں کئے اور ہوا کئے!

یہ غزل پرانی ہے دریا مرے آگے، صحرا مرے آگے اس پر بھی ایک سال گذر چکا ہے قلعہ مبارک کے مشاعرہ کی غزل ہے

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے آگے — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے — آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۱۸۵۴ء — (خطوطِ غالب صفحات ۱۴۳/۱۴۴)

بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہونچا میرا خط نہ لکھنا تغافل و تساہل سے نہ تھا آپ اپنے دَورے کا جانا لکھ چکے تھے میں چاہتا تھا کہ جب، آپ علی گڑھ آئیں اور مجھ کو اطلاع دیں تو میں خط لکھوں حافظہ بیگم کو دعا پہونچے حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست رکھے اور تیسوں پارے حفظ کرنے کی توفیق دے۔

منشی عبداللطیف کا حال معلوم ہوا خدا پر نظر رکھو اور تقویت کی رعایت کیے جاؤ، لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ جدوار بہت مفید ہوگی اگر وہاں اچھی نہ ملے تو لکھ کو لکھ بھیجو میں یہاں سے بھیج دوں۔ تہر نیمروز تمھارے پاس ہے اب اور کیا کروگے اگر ایسی ضرورت ہے تو لکھ بھیجو میں دو تین جلد اور بھیج دوں ان دنوں میں دو رباعیاں اردو میں کہی ہیں ان کو بہ نظر اصلاح دیکھیے

مرسلہ پنجشنبہ ۱۸ رجمادی الثانی ۱۲۷۱ھ، ۸ مارچ ۱۸۵۵ء از اسد اللہ

کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہات کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ ہوے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

(خطوط غالب صفحہ ۱۵۲)

بھائی تمہارا غصہ میرے سر آنکھوں پر۔ واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو البتہ یہ خیال تو مجھ کو آیا کہ دیکھو بھائی کو میرے کلام سے انس نہیں ہے ورنہ ایسی چیز کو ہاتھ سے نہ دیتے نہ یہ کہ اس کا دینا باعث اس کا ہوا ہو کہ اور نسخہ تم کو نہ بھیجوں۔ چھاپے خانے والوں نے سوداگروں کے ہاتھ بطریق پیشگی سو سو دو دو سو مجلد بیچ ڈالے تھے چھاپہ خانے سے جو میں نے منگایا تو مجھ کو نہ ملا اب متفرق کتاب فروشوں سے کہہ دیا ہے کہ کوئی نسخہ ہاتھ آیا اور میں نے بھیجا میرا تو یہ حال ہے جو کچھ میں نے کہا پھر جب تک تمہارے پاس نہ بھیج لوں مجھ کو چین نہیں آتا تم کو سخن فہم جانتا ہوں رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے اب صبحدم تم کو لکھتا ہوں خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں۔ عید کی تہنیت صرف روپے بچانے کی تھی یعنی اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ کو چار روپے نذر دینے پڑتے جب سب دوں میں نہ رکھوں نہ دیوان میں نہ لکھوں تو حضرت کو کیوں بھیجوں؟

پلنگ کے پائے ڈھونڈھ رہا ہوں خاطر عاطر اس طرف سے جمع رہے۔ لو غزل سنو، مگر غور سے دل لگا کر۔ اس کی نقل جہاں چاہو وہاں بھیجو؎

ای ذوق نوا سنجی بازم بہ خروش آور — غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور
گر خود نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارم — دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور
ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہ ویرانہ — شمعے کہ نخواہد شد از باد خموش آور
شورابۂ ایں وادی تلخ است اگر راہی — از شہر بسوئے من سرچشمۂ نوش آور

دانم کہ زرے داری ہر جا گذرے داری | مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور
گر مغ بکدو ریزد بر کف نہ و راہی شو | ور شہ بہ سبو بخشد بردار و بدوش آور
ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل | آں در رہ چشم افگن ایں از پے گوش آور
گاہے بہ سبکدستی از بادہ ز خویشم بر | گاہے بہ سیہ مستی از نغمہ بہ ہوش آور

غالب کہ بقا لیش باد ہم پایۂ تو گر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئیہ پوش آور

(خطوط غالب صفحہ ۱۶۱) ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۵ء

(ترجمہ) اے ذوق نوا سنجی مجھے پھر آمادہ شورش کر اور میرے ہوش پر شبخون مار۔

۲۔ اگر خون سر خود بخود نہیں نکلتا تو اسے آنکھوں کے راستہ زمین پر برسا دے۔ دل کو خون کر اور خون کو اپنے سینے سے جوش زن کر۔

۳۔ اے عقلمند دوست تو بیاباں کا راستہ جانتا ہے ایسی شمع لا جو ہوا سے نہ بجھ سکتی ہو۔

۴۔ اس وادی کے کھاری پانی کا چشمہ بہت تلخ ہے اگر تو دلیر اور سخی ہے تو شہر سے میری جانب چشمۂ شیریں لا۔

۵۔ میں جانتا ہوں کہ تیرے پاس روپیہ پیسہ ہے اور تیرا ہر جگہ گذر ہے اگر سلطان تجھے شراب نہ دے تو کلال کی دوکان سے لے آ۔

۶۔ مغ۔ جس کی تحویل میں شراب رہتی ہے اگر تیرے تونبے میں شراب ڈال دے تو اسے ہتھیلی پر رکھ کر راستہ لے یعنی اسکے ہاتھ پر رکھ کر چلا آ اور اگر بادشاہ تجھے ایک سبو بخش دے تو اسے کندھے پر اٹھا کر لے آ۔

۷۔ ریحان مینا سے اگتی ہے اور نغمہ قلقل سے ٹپکتا ہے ریحاں کو آنکھ کی راہ میں ڈالدے اور اسے کان کے لیے لے آ۔

۸۔ کبھی جلد اس شراب کی تاثیر کی وجہ سے مجھے بیخود بنادے اور کبھی اس بے مستی کی حالت میں نغمہ سنا کر مجھے ہوش میں لے آ۔

۹۔ غالبؔ، خدا اس کو جیتا رکھے اگر تیرے ساتھ نہ آسکے تو خیر۔ اس کمبل پوش درویش سے کوئی غزل یا کوئی شعر لے آ۔

بھائی صاحب۔ کئی خط اس عرصہ میں تم کو لکھے مگر جو لکھنا تھا وہ بھول گیا۔ پلنگ کے پائے مسلّم لیکن یہ تم نے نہیں لکھا کہ پائے بڑے پلنگ کے ہوں یا چھوٹی سی پلنگڑی کے ہوں۔ مقدار مالیت تو معلوم مگر اندازہ پستی و بلندی کا نہیں معلوم۔ اس کا لکھنا ضرور رہا ضرور لکھو اور جلد لکھو۔

بھائی، کل مرزا تفتہ کا خط آیا انھوں نے کچھ قطعات اصلاح کے بھیجے ہیں از آنجملہ دو قطعے تمھاری مدح اور اظہار محبت میں ہیں۔ ایک مجھ کو پسند آیا وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

دگر گریہ کند سر بہ مرگ ما زنیاں
دگر کہ از پش ایگونہ ہامی ہو بچیکد
بود حقیر بہ فن محبت آں یکیتا
کہ خوں شود دل ما و ز چشم او بچیکد

چوتھے مصرعہ میں خیال نازک ہے۔ خدا اس عزیز کو جیتا رکھے اور اس کے حال پر رحم کرے جواب طلب۔

از اسد سہ شنبہ نہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

(خطوط غالب صفحہ ۱۶۲)

لہ گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اندیشہ گواہ است و مشاہدہ شاہد کہ کاستن از بہر آراستن است و زدودن از برائے
افزودن۔ بسیرہ را چوں بہار آیند بہ پیرایند و بادہ را تا پیمایند بہ پالایند۔ نی پارہ تا بریدن پارہ
ازاں بخردگی نزود، صورتِ قلم باں نتواں داد و کاغذ را تا بریدن لخت لخت نہ شود و نیم
نامہ نتواں نہاد۔ آرے در کارگاہ کون و فساد ہیچ فساد بے کون و ہیچ کون بے فساد نیست
از عالم آفرینندہ بہ سپہر بردند و چندے ہم بداں پایہ نگاہ داشتند و پیش بر زمین زدند
تا پیکر چناں بہ خاک نقش بست کہ آں نقش بہ ہیچ گزند از خاک نتواں سترد۔ گومی
دریں کون و فساد کہ ناگاہ روے داد مرا بردند خستہ را بجای من آوردند کہ مرگ از زیستن
خندہ از گریستن نشناسد۔ یارب ایں پیکر کہ بہ خاک نقش بست و ایں نقش کہ ازاں
پیکر بہ خاک نشست زود باشد کہ از روے خاک نہ خاک سپرند۔ دریں روزگار کہ از
بندِ ستم رستگار و بہ بندِ غم گرفتارم۔ سخنور جادو بیان از خود رفتہ منشی ہرگوپال تفتہ را بہ مرا
گذار افتاد۔ شنیدم کہ آں لطف گستر کہ بہ وطن رفتہ بودند۔ اینک آمدہ اند۔ عجب آمد کہ
بہ نامہ بنواختند۔ ہمانا بہ ہم نشینی و ہم زبانی من با تفتہ ہم زبانی و ہم نشینی خویش را من

لہ جو کچھ غالبِ ناکام پہ گذری وہ کہنے کے قابل نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس بندہ کا کوئی خدا نہ تھا۔

شناختند و حقا کہ چنیں است دوشش یکے از شاہزادگان تیمورخانیہ بزم سخن آراستہ بود و سخن سنجان را بہ غزل خوانی خواندہ مرا کہ بہ گفتن ریختہ سری نماندہ اگرچہ دل بہ سگالش منشہ بود روز یکہ شب بداں انجمن بایست رفت خاصہ ہنگامی کہ سوارہ رہ مے بردم بیتی چند بے خواست از دل غمزدہ سر بر زد۔ چنانچہ شمامے فرستم و مے خواہم کہ ہم دریں زمیں غزلے گفتہ من فرستند۔

از اسد اللہ نگاشتہ ۱۶ ربیع الاوّل ۱۲۶۴ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۸۴۸ء

(ترجمہ) نکر گواہ ہے اور مشاہدہ شاہد کہ کانٹ چھانٹ آرائش کے لیے رہے اور صفائی نمائش کی خاطر۔ سرو کو جب آراستہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں اور شراب کو پیمانوں میں الٹنے سے پہلے چھان لیتے ہیں۔ بانس کے ٹکڑوں کو جب کانٹ چھانٹ کر چھوٹا نہ کریں اسے تراش کر قلم نہیں بنا سکتے جب تک کاغذ کے ٹکڑے نہ کریں اس کا نام خط نہیں رکھ سکتے۔ اس کارگاہ تعمیر و تخریب کے بغیر نہیں کوئی تخریب تعمیر بغیر نہیں۔ مجھے مٹی سے پیدا کیا اور آسمان پر اٹھا لے گئے اور کچھ عرصہ تک میرے اس مرتبہ کی نگہداشت رکھی اور اس مرتبہ پر قائم رکھا بعد ازیں زمین پر دے مارا اور میرا پیکر زمین پر ایک ایسا نقش بن کر رہ گیا جیسے کسی نشتر کی تیز نوک اس خاک (یعنی عالم وجود) سے اٹھا لیتی۔ گویا مجھے اس عالم تخریب و تعمیر میں جو اچانک وجود میں آئی لے گئے اور میری جگہ ایک خستہ کو وجود میں لے آئے جو مرگ و زندگی اور ہنسنے رونے میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔ یارب یہ پیکر (صورت انسانی) جو خاک پر نقش ہو گیا اور یہ جو نقش جو اس پیکر کی وجہ سے خاک میں بیٹھ گیا عنقریب روئے زمین سے زیر زمین چلا جائے۔ ان دنوں جب میں ظلم کی قید سے چھٹ گیا ہوں اور غم کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہوں سخنور جادو بیان و از خود رفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کا خیال آ گیا میں نے سنا کہ وہ کرم فرما جو وطن گئے ہوئے تھے آپ کے پاس آئے ہوئے ہیں تعجب ہے اپنے خط میں اس کا ذکر نہ کیا البتہ میری اور تفتہ کی مجالست و گفتگو گزری

اور اپنی مجالست و گفتگو جانا ہو اور حقیقت بھی یہی ہے۔

کل رات شہزادگان تیموریہ میں سے ایک نے مشاعرہ منعقد کیا تھا اور شعراء کو غزلخوانی کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میاں نے اس میں بہت دل لگایا لیکن طبیعت ریختہ کہنے پر مائل نہ ہوئی لیکن اس روز جس کی رات مجھے اسی انجمن میں شرکت کرنی تھی تو خاص اسوقت جب میں سواری میں جا رہا تھا چند شعر خود بخود دل غمزدہ سے نکل آئے چنانچہ ان اشعار کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اس زمین میں غزل کہہ کر مجھے بھیجدیں۔

(مرقع غالب)

۱؎ بھائی! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو ابہام آپڑے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریض معشوق سے کہے گئے ہیں۔ موت کی راہ نہ دیکھوں! کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے ایک دن آئے ہی گی انتظار ضایع نہ جائے گا۔ تم کو چاہوں! کیا خوب! کیوں چاہوں! کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے ابھی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے / پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے / تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے / کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب / کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(مرقع غالب)

"غلام حسنین قدر بلگرامی"

حضرت!

میں نے چاہا کہ حکم بجا لاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر کیا کروں؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے؟ اگر بہ شمول آپ خود نظرِ ثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔ جس کاغذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے، تو بین السطور زیادہ چھوڑتے ہیں۔ جب اس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کرو تب تک وہ اصلاح کا طور بنے میرا کام اصلاحِ عبارت ہے، نہ کتابت۔

"زردشتِ آتش کدہ الخ" زردشت کو آتش کدہ سے وہ نسبت نہیں جو ساقی کو میخانے سے۔ زردشت بہ اعتقادِ مجوس، پیغمبر تھا۔ آتش کدے کے پجاری کو "موبد" اور "ہیربد" کہتے ہیں۔ "آبِ حرامِ اشتیاق" "آبِ حرام" "شراب" کو محلِّ مناسب پر کہیں تو کہیں؟ ورنہ "نبیذ" اور "بادہ" اور "رحیق" اور "مے" اور "قرقف" اور "راوق" کی طرح عام نہیں۔ ناچار "شرابِ شوق" یا "بادۂ شوق" لکھنا چاہیے "اشتیاق" سے "شوق" بہتر ہے۔

"ماہم دو سہ جاگی علی التواتر زدہ بودم"۔ "ما زدہ بودم" تمہارا دل اس ترکیب کو قبول کرتا ہے؟ "من زدہ بودم" یا "ما زدہ بودیم" اس کے علاوہ "دو سہ جاگی" بہ کافِ فارسی، یعنی چہ؟ جام، معلوم کافِ تصغیر کا "جامک" چاہیے۔ "جاگ" کیا؟ مگر یہ پیروی تقلیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر اپنی بنانا چاہتا ہے۔

ظہوری، جلال ظہیر، طاہر، وحید کسی کے ہاں "جام" کو "جامگ" نہیں لکھا۔ "دو سہ جامگی" کی جگہ "دو سہ ساغر" یا "دو سہ قدح" لکھو۔

"یا چناری گلستاں بر باغباں است و تیماری او بر قدرداں" میں اس فقرے کو نہیں سمجھا۔ یعنی "بر باغباں" کیا ہے؟ "تیماری" کیا ہے؟ "تیمار" بہ معنی "بیمارداری" و "غم خواری" ہے۔ جب یہ لفظ خود افادہ معنی مصدری کرتا ہے، تو یائے مصدری کیسی۔؟

"تیرہ شبی ہا بسر آمد۔" "تیرہ شبہا بسر آمد" خیر "تیرہ شبی ہا بسر آمد" یعنی چہ؟

"لیلائے دیدم کہ با ہزار طرہ طرار" "طرہ" "زلف" کو کہتے ہیں وہ دو ہوتی ہیں۔ نہ کہ ہزار در ہزار۔ "جامگی" مکرر دیکھا گیا معلوم ہوا کہ حضرت نے جو کہیں "جامگی خوار" دیکھا ہے تو اس کو "جام خوار" بہ معنی "شراب خوار" سمجھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ "جامگی خوار" اس نوکر کو کہتے ہیں کہ جس کی تنخواہ کچھ نہ ہو۔ روٹی کپڑے پر اس سے کام لیتے ہوں۔ نظامی نوکر حضرت خضر کے کتنا روزینہ سخن پاتے ہیں، جو خضر فرماتے ہیں۔

کہ اے جامگی خوار تدبیر من　　زجام سخن چاشنی گیر من

"در توبہ باز است و باب رحمت فراز" معنی اسکے یہ کہ "توبہ کا در کھلا ہے" اور دروازہ رحمت کا بند۔ "فراز" اضداد میں سے نہیں ہے۔ "باز" کھلا "فراز" بند۔

"قدر زعفراں زار را بوئے گل کرد" اس کا لطف کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "قدر زعفراں زار" کیا؟ اور پھر اس کو کس نے "بوئے گل" کر دیا؟

"سکرر" کدام زبان است، عربی یا فارسی؟

"حسب لیاقت خود" کافی است "خودم" چہ محل دارد؟ گر ہماں شیوۂ قتیل۔"

"بندۂ مجبورم" ہماں سکۂ قتیل، صاحب بندہ، تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو۔ نہ مغل کے بچے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا

سلام - فقط زیادہ - زیادہ -
جناب نوردوز علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام نیاز عرض کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ بیرنگ خط کا ایک آنہ دینا پڑے گا ہر مہینے میں آٹھ خط تک بلکہ سولہ خط تک میں نہ گھبراؤں گا۔ بھیجیے۔ رہا جواب کا لکھنا۔ کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے۔ ہر روز صبح کو قلعے جانا دوپہر کو آنا۔ بعد کھانا کھانے کے حضرت کے مسودوں کا درست کرنا۔ احباب کے خط لکھنے کی فرصت بہت کم ہاتھ آتی ہے۔ والسّلام قبل غدر ۱۸۵۷ء
(خطوط غالب صفحات ۲۵۶/۲۵۷)

(سوال)

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ناسخؔ :- رہن رکھوا کر ترا عمامہ دلوا دوں شراب — زاہدا تجھ کو کروں مرہونِ احساں تو سہی

اس "سہی" اور "تو سہی" کا ترجمہ فارسی لغت میں کیا آیا ہے؟

(قادر)

(جواب) اسما کے یا لغات کے واسطے یہ بات ہے کہ عربی میں یہ کہتے ہیں۔ اور فارسی میں یہ اور ہندی میں یہ۔ طرزِ گفتار ہندی کا فارسی اور فارسی کا ہندی کبھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً "چوری کا گڑ میٹھا" اس کی فارسی نہ پوچھیے گا۔ مگر نادان۔ "سہی" اور "تو سہی"۔ کی فارسی کیونکر بنے؟ یہ روزمرہ اردو ہے۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اسی مطلب کے مطابق فارسی عبارت یوں ہو سکتی ہے: وصل اگر نیست، حسرت نیز عالمے دارد۔

زاہدا تجھ کو کروں مرہونِ احساں تو سہی

ایک نوع کی تنبیہہ، ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ "نامرد باشم اگر فلاں کار نہ کنم۔ تا فلاں کار نہ کنم نیاسایم" اہلِ ہند کی فارسی اسی طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں انھوں نے فارسی کے قواعد کی تطبیق عربی سے چاہی اور اردو کے خاص روزمرہ کی

فارسی بنایا کیے۔ ہندی میں "کچھ نہیں کی جگہ" خاک نہیں۔ بولتے ہیں۔ فارسی میں "ہیچ نیست" کی جگہ "خاک نیست" کبھی کوئی نہ کہے گا قتیل چاروں خانے چت گرا ہے۔

"کشتہ بر کشتہ تپاں بود دگر خاک نہ بنود"

یعنی "ہیچ نہ بود" لاحول ولا قوۃ! ایک جگہ سے مجھ کو خط آیا چونکہ میں بلی ماروں کے محلے میں رہتا ہوں اوس نے پتا لکھا کہ "در محلہ گربہ کشاں" واہ فارسی!

غالب

مردم از من داستاں راند ز دا ز دہ رانِ چرخ

گشت صرفِ طعمۂ زاغ و زغن عنقاے من

(خطوطِ غالب صفحات ۲۵۷ ، ۲۵۸)

نمبر ۸: کاٹ کر غیروں کے سر لائے جو میری نذر کو
ڈال دوں سونے کا آنڈو پانو میں جلاد کے

"آنڈو" بہ دالِ ہندی یا بہ دالِ عربی۔ بھائی واللہ۔ یہ لفظ کبھی میری زبان پر نہیں آیا۔ اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہاں، سنا ہے کہ فلانا سردار ایسا بہادر ثابت قدم تھا کہ معرکۂ کارزار میں ہاتھی کے پانوؤں میں "آنڈو" ڈلوا دے۔ ظاہرا کوئی چیز ہوگی کہ ہاتھی کو مانع رفتار ہو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بند خاص ہے۔ استعمال اس لفظ کا محلِ انعام میں نہ چاہیئے۔ غالب

"آبتن" اور "آبست" کے باب میں یہ قول معترض کا غلط ہے کہ "آبست" کو بجائے "آبتن" جائز سمجھتا ہے "آبست" کوئی لفظ نہیں ہے "آبستن" اصل لفظ اور "آبستنی" مزید علیہ۔ یہ دونوں صحیح بلکہ "آبستنی" زیادہ فصیح۔ اگر معترض فیضی کو نہیں مانتا تو آپ معترض کو کیوں مانتے ہیں؟ فیضی کی سند مقبول اور مسموع "ارمغاں" اور "ارمغانی" "آبستن" اور "آبستنی" ارے یہ تو فارسی لغت ہیں۔ فارسی گویوں نے "حضور" کو "حضوری" اور "فضول" کو "فضولی" اور "نقصان" کو "نقصانی" لکھا ہے۔

آج تک سنا نہیں کہ "رب کبریا" کسی نے لکھا ہو۔ "کبریائے الٰہی" یعنی خدا کی بزرگی۔ اس نظر یہ "رب کبیر" لکھیں گے، نہ رب کبریا۔ کبریا صفت واقعی ہے لیکن اگر صفت سے موصوف کی مراد رکھیں تو ممکن ہے کہ "زید عدل" "جناب کبریا بجائے

جناب الٰہی جائزہ ایک نکتہ دقیق ہے یعنی مذہب حقہ امامیہ میں مجموعِ صفات عین ذات ہیں۔ پس اگر ہم نے خدا کو محض قدرت یا محض عظمت کہا تو موافق ہدایت نبی آئمہ آئمہ کے ہمارا قول درست ہو۔

"حال" کی جگہ "حالات" یا "احوال" لکھنا قبیح نہیں ہے۔ خصوصاً احوال کہ یہ بمعنی واحد مستعمل نہیں ہوتا۔ جیسے "حور" کہ بمعنی "حورا" کے اہل زبان اس کو صیغۂ واحد قرار دے کر الف نون کے ساتھ اس کی جمع لاتے ہیں سعدی کہتا ہے۔

حورانِ بہشتی را دوزخ بود اعراف　　از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

بلکہ "حور" کو "حوری" کہہ کر جمع "حوریاں" لاتے ہیں۔ حافظ لکھتا ہے:

شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد　　حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

میں نے ایک مقطع میں حال کی جگہ احوال لکھا ہے:

جان غالبؔ تاب گفتاری گماں داری ہنوز
سخت بے دردی کہ می پرسی ز ما احوال ما

آخر مجھ کو ادبضی کو معترض سے زیادہ اساتذہ عجم کے کلام پر اطلاع ہے۔ وہ "آبستنی" کیوں لکھتا؟ اور میں "احوال" کیوں لکھتا؟ صائب کی ایک غزل جس کا ایک مصرع یہ ہو۔　　ہر لحظہ دارم نیتے چوں قرعۂ رمالہا

اسی غزل میں اوسی نے ایک جگہ "احوالہا" لکھا ہے

داد کا طالب غالبؔ

"ملک مغرب، بلدہ دہلی، کٹرہ رودگراں" یہ کیا لکھا کرتے ہو؟ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ محلہ غلط۔ ملک زائد۔ ہندوستان میں دلّی کو سب جانتے ہیں اور دلّی میں مجھ کو سب پہچانتے ہیں۔　(قبل غدر ۱۸۵۷) انصاف کا طالب غالبؔ

(خطوط غالب صفحات ۲۵۹/۲۶۰)　　

"تپش" کا لفظ متروک اور مردود تپیخ غیر فصیح یہ پنجاب کی بولی ہو مجھے یاد ہے کہ میرے لڑکپن میں ایک اصیل ہے ہمارے ہاں نوکر رہی تھی وہ "تپیں" بولتی تھی۔ تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اوس پر ہنستی تھیں۔

خروشِ رعدِ غراں می شنیدہ پادر رکاب ازیم
غاں بر سینہ چوں پیچد کرنگ برق جولانش

یہ شعر کا ناطق کا ہے اور ناطق قوم کا بلوچ۔ سندھ کا رہنے والا اس کا منطق کیا اور اس کی زبان کیا؟ پادر رکاب ہونا عبارت ہے سیر و سفر کے لیے آمادہ و مستعد ہونے سے خواہی منشاے عزیمت خوف ہو خواہی اور سبب "غاں بر سینہ پیچیدن" مہمل و محض مہمل نہ روزمرہ نہ محاورہ نہ اصطلاح نہ مفید معنیِ درنگ نہ مفید معنیِ شتاب۔ غالب

"طیارہ" صیغہ مبالغہ کا ہے۔ لغت کا عربی املا اس کی طاے حطی سے "طیر" ثلاثی مجرد "طائر" فاعل "طیور" جمع بازداروں میں اس لفظ کو جنم لیا حقیقت بدل گئی طوے تے بن گئی یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا۔ بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ "فلاں باز، فلاں شکرہ، طیار شدہ است و صید می گیرد" بہرحال اب تاے قرشت بہ معنی آمادہ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاہیئے اور عبارتِ فارسی میں استعمال اس کا کبھی جائز نہ ہوگا

فقیر کے نزدیک "نقاب" اور "قلم" اور "وہی "ترجمۂ" جعزات" یہ تینوں اسم مذکر ہیں۔ منکر سے مجھے بحث نہیں، مجیب کا میں احسان مند نہیں۔ لغت فارسی اور روزمرہ فارسی ہو تو اہل زبان کے کلام سے سند کریں۔ منطق فارسی میں تذکیر و تانیث کہاں؟ اس امر کے مالک اور اہلِ زبان ہم ہیں اور یہ ہم صیغہ متکلم مع الغیر ہے یعنی ہم اور تم اور مجموع شرفا اور شعرائے دہلی و لکھنؤ ایسے دس آدمی کا اتفاق نہ ہے۔ زیادہ جھگڑا بے فائدہ۔ غالب

بنائیں قدر کی غزلیں جناب غالب نے
تمام جوہر تیغ زباں ادھر آئے

"غزل" کی زے یہاں ساکن ہے لیکن یہ سکون جائز ہے۔ "قدم" مفرد قدموں جمع ہے۔ "کھو رہا ہوں" متعدی ہے۔ پوربی اس کو لازمی جانتے ہیں۔ لازمی "کھو گیا ہوں"۔ "ہم کہیں گے" "جاگتے ہیں" اہل پورب کہیں گے "جگتے ہیں" "جان و دل" "دل و جگر" یہ صحیح ہے۔ "جان و جگر" ٹکسال باہر ہے۔

"فریاد" مونث ہے "فریاد کرنی" چاہیئے۔ "فریاد کرنا" انگریزی بولی ہے "فکر" مونث ہے۔ "معشوق" کو ہمزاد بنانا ظرفا کو اپنے اوپر ہنسانا ہے۔

لوائمر:

اندیشۂ بلند رو لامکاں نورد	چوں خواست بام جاہ ترا نردباں نہاد
دیدش ہماں بجا چہ سپہر از فراز کہ	بعد از ہزار پایہ کہ بر فرقداں نہاد

پہلے مصرع میں "اندیشہ" فاعل ہے۔ "خواست" کا جو مصرع ثانی میں (نہد) "نہاد" بہ معنی مصدری ہے۔ دوسرے شعر میں "دید" کا اور "نہاد" فاعل وہی "اندیشہ" ہے۔ ایک بات اور سمجھو کہ جب پہاڑ کے پاس سے آسمان کو دیکھو گے تو یہ معلوم ہوگا ہم پہاڑ پر چڑھ جائیں تو آسمان کو چھولیں مگر جب چوٹی پر پہنچو گے تو

آسمان کو اتنا ہی دور پاؤ گے جتنا زمین سے نظر آتا ہے" فرقداں "ایک صورت ہے یا ایک کوکب ہے آٹھویں آسمان پر ہمارے قیاس میں آیا کہ فرقداں پر گئے وہاں بھی قریب نہ پایا۔ فرقداں پر ہزار پائی[1] رکھی۔ اوس پر چڑھ کر دیکھا۔ تو بام ممدوح ہیں اور اس مقام میں اتنا ہی بعد ہے جتنا پہاڑ میں اور آسمان میں۔ یہ مبالغہ حد تبلیغ و غلو سے گذر گیا۔

"لگا دیتے ہو" اور "اٹھا دیتے ہو"۔ خطاب جمع حاضر ہے اور تعظیماً مفرد پر آتا ہے یعنی تم۔ معشوق مجازی کو تم اور تو دونوں طرح یاد کرتے ہیں۔ خدا کو یا "تو" کہتے ہیں یا صیغۂ جمع غائب۔ یعنی صیغہ جمع غائب کا نظر بہ قرینہ افادہ قضا وقدر رکھتا ہے۔ تمہاری غزل میں دو چار جگہ "دیتے ہو" اس طرح آیا ہے کہ محبوب مجازی اوس سے مراد کبھی نہیں ہو سکتا۔

لاکے دنیا میں ہمیں زہر فنا دیتے ہو ہائے اس کھول کھلیاں میں دغا دیتے ہو

کہو کس سے کہتے ہو؟ سوائے قدر و قضا کے کوئی رنڈی کوئی لونڈا اس کا مخاطب نہیں ہو سکتا۔ اور علیٰ ہذا القیاس دو ایک شعر اور بھی۔ ناچار صیغۂ جمع لکھ دیا تاکہ "خوباں" اور "بتاں" کی طرف ضمیر راجع ہو یا شخص واحد کی طرف "آپ" کے لفظ کے ساتھ یا قضا و قدر کی طرف۔ اب خطاب معشوقانِ مجازی اور قضا و قدر میں مشترک رہا[2] غالب

(س) "بود" اور "باشد" کہ دونوں صیغے مضارع کے ہیں بمعنی "ہست" آتے ہیں یا نہیں۔؟ قدر

(ج) البتہ آتے ہیں ——— غالب

---

[1] یعنی بہت سے ڈنڈوں کی سیڑھی۔ [2] مطلب یہ کہ مذکورہ بالا شعر یوں کر دیا گیا۔
لاکے دنیا میں ہمیں زہر فنا دیتے ہیں ÷ ہائے اس کھول کھلیاں میں دغا دیتے ہیں۔ (کلیات قدر مطبوعہ مطبع مفید عالم آگرہ ص ۲۲۰)

(س) نظم و نثر میں ماضی مطلق کو ماضی استمراری کے معنی پر لکھنا کیسا ہے؟ قدر

(ج) بیجا ہے۔ جب تک علامتِ استمرار نہ ہو معنی استمراری کیوں کرنے جائیں گے؟ غالب

(س) فارسی میں مصدر مقتضب اور غیر مقتضب کی کیا شناخت ہے؟ قدر

(ج) خود عربی میں مصادر کی صفت مقتضب نہیں آئی فارسی میں کہاں سے ہوگی مقتضب صفت بحر کی ہے نہ صفت مصدر کی۔ غالب۔

(س) کس قسم کے مصدر لازمی سے مصدر متعدی بنتا ہے اور کس طور کے مصدر سے نہیں بنتا؟ قدر

(ج) جب لازمی کو متعدی کرنا چاہیں تو مفارع میں سے مصدر بنائیں اور اوس میں فقط الف نون یا الف نون اور تحتانی بڑھائیں مثلاً گشتن کو "گشتاندن" نہ لکھیں گے "گردد" سے مصدر بنائیں گے "گردیدن" اور اوس کو "گرداندن" اور "گردانیدن" کہیں گے۔ جس مصدر کے ساتھ مفارع نہ ہوگا وہ متعدی نہ بنے گا۔ جیسے "برشتن" اور "رستن"۔ غالب۔

(س) پناہ کا ترجمہ لغت اردو میں کیا آیا ہے۔ قدر

(ج) اردو مرکب ہے فارسی اور ہندی سے یعنی "پناہ" کا لفظ مشترک ہو اردو میں اور فارسی میں "پناہ" کا ترجمہ اردو میں پوچھنا نادانی ہے۔ ہاں "پناہ" کی ہندی "آسرا" ہے۔ غالب

"بر نہ آنا" فصیح "نہ بر آنا" بحال باہر۔ قافیہ ہائے اصلی الفیہ سیکڑوں ہیں۔ اون کو چھوڑ کر "نسخہ" اور "نامہ" اور "افسانہ" ان الفاظ کو قافیہ کرنا تمھارے نزدیک نامناسب نہیں؟ ایسا قافیہ غزل بھر میں ایک جگہ لکھو۔ غالب

(خطوط غالب صفحات ۲۶۰ - ۲۶۳)

حضرت

آپکے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ دوسری طرف اگر کچھ لکھا جائے تو میری تحریر ایک طرف تم خود اپنی عبارت کو نہ پڑھ سکو گے۔ ناچار جداگانہ ورق پر سوالات کا جواب لکھتا ہوں۔

"رنگ" بہ وزن "سنگ" ترجمۂ لون اور لفظ فارسی الاصل ہے۔ جب اس کو اردو میں منصرف یا بہ قول بعضے متصرف کریں گے تو نون کا تلفظ موہوم سا رہ جائے گا۔ "رنگنا" بہ وزن "چندجا" نہ کہیں گے۔ بلکہ وہ لہجہ اور ہے جیسا کہ اس مصرع میں

"ہم نے کپڑے رنگے ہیں شنگرفی"

یہ صحیح ہے اور فصیح ہے۔

"ہم نے رنگے ہیں کپڑے شنگرفی"

بہ اعلانِ نون گنواری بولی اور غیر صحیح اور قبیح ہے۔

"خرام" کو کون مونث بولے گا۔ مگر وہ کہ دعوائے فصاحت سے ہات دھولے گا۔

"رفتار" مونث اور "خرام" مذکر ہے "رفتار" کی تانیث کو "خرام" کی تانیث کی سند ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔

حرف مسروری جس کو ثنائی بھی کہتے ہیں موحدہ سے زائے معجمہ تک الف کی جگہ تحتانی بھی قبول کرتے ہیں۔ مولوی آلِ نبی سہارنپوری اور مولوی امام بخش دہلوی

میں اس بات پر بڑا جھگڑا ہوا مولوی امام بخش باکوبے کہنا جائز نہیں رکھتے تھے۔ آخر مولوی آلِ نبی نے آئمۂ "فن کلام" کے کلام سے اس کا جواز ثابت کر دیا مگر صرف ازروے تلفظ اور اس کی اجازت کا کوئی قاعدہ خاص اسکے واسطے نہیں۔ اردو میں طا کو طوے اور ظا کو ظے کہتے ہیں اور باقی حروف کے آخر میں تحتانی بولتے ہیں۔ لسان عرب و عجم میں موحدہ سے زاے معجمہ تک اواخر حروف میں الف بھی لاتے ہیں اور تحتانی بھی۔ طا۔ظا، کو طا، ظا ہی کہیں گے۔ نہ طوے یظوے نہ "طے ظے" علیٰ ہذا القیاس حروف باقیہ۔

راقم اسد اللہ خاں۔

انوری:-

بعہدِ جودِ تو دائم بریک شکم زاید زغایتِ کرم اندر کلام تو "نے" نیست
زمانہ صوتِ سوال از صدائے "آرے" را باعتقادِ تو ضد ست نون "گر"دیے" را

(خطوطِ غالب صفحات ۲۶۳/۲۶۴)

حضرت،

کیا فرماتے ہو؟ ہوا بھی ہو "قضا بھی ہو" اس ردیف کے ساتھ قافیۂ معمول آ نہیں سکتا۔ میتابی ہو" مہتابی ہو" کیونکر درست ہوگا۔ وہاں موحدہ کے بعد ہائے ہوز ہے۔ یہاں موحدہ کے آگے (یا) چاپي بہ بائے فارسی اور یائے حطی ہے۔"چاپي" اور "کاپي" اور" راپي" اور" باپي" یہ قافیہ ہم گر ہو سکتے ہیں۔"چاپي" لغت انگریزی ہے۔ اس زمانہ میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیے ہیں اوروں نے بھی باندھے ہیں۔

"روبکاری" اور "طلبی" اور "فوجداری" اور "سررشتہ داری" خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔"چاپي" بہ معنی "کلید" شوق سے لکھو نہ "چابھی"۔ ناسخ لکھتا ہے میم صاحب کے آگے کے الفاظ بھول گیا ہوں۔ آخر مصرع یہ ہے .... مس کے

ناز بیجا اٹھاؤں کس کس کے

الٰہی بخش خاں معروف لکھتے ہیں:

نگین دل سوا کھو دے تو گھر نیلام ہو جائے

والسّلام۔ صاحب، تم نے مثنوی خوب لکھی ہے! کہیں املا میں، کہیں انشا میں جو اغلاط تھے وہ رفع کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اس کے تحت میں لکھ دی۔ فکرِ تاریخ مثنوی سے مدت العمر معاف رہوں۔ (۱۲۷۴ھ، ۱۸۵۸ء) غالب

۱۰۶ (خطوطِ غالب صفحات ۲۶۴/۲۶۵)

منشی جواہر سنگھ جوہر

برخوردار

تمھارے خطوں سے تمھارا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا اور ہیرا سنگھ کا ادھر روانہ ہونا معلوم ہوا۔ ہاں لالہ چھج مل اکثر بیمار رہتے ہیں۔ ان دنوں میں خصوصاً اس شدت سے نزلہ چھاتی پر گرا کہ وہ گھبرا گئے اور زیست کی توقع جاتی رہی بارے کچھ فرصت ہوگئی ہے۔ بھائی، یہ آفتاب ہر کوہ میں ہیرا کا ان کے پاس رہنا اچھا ہے۔ تم سے جو ہوسکے گا تم اس کے مصارف کے واسطے مقرر کر دو گے۔

غزل تمھاری ہم کو پسند آئی۔ اصلاح دے کر بھیج دی گئی، اس کا تم خیال رکھا کرو کہ کس لفظ کو کس معنی کے ساتھ پیوند ہے۔

چرا ز یاس بجان امید وار افتد

یہاں افتد مہمل ہے "یاس بہ دل افتادن" "یاس بہ جان افتادن" روزمرہ نہیں اور بھی کئی "افتد" ایسے ہی ہیں۔

سیاہ بختم اگر بر سرم گزار افتد لبان سایہ ہما نیز سوگوار افتد

سوگوار ہونا سایے کا بہ اعتبار سیاہی رنگ ہے۔ اب یہاں دونوں "افتد" ٹھیک ہیں "گزار افتادن" روزمرہ اور دوسرا افتد بمعنی "واقعہ شود"

شنیدہ ام بہ جفاے تو مبتلاست عدو چرا نہ شور بہ جان امید وار افتد

"شور افتادن" روزمرّہ ہے اور "یاس افتادن" غلط

بہ حیرتم کہ ز دوزخ کسان دوزخ را کجا پرند چو آہم شرارہ بار افتد

یہاں "افتد" بمعنی "واقع شود" ٹھیک۔

نہ گبرم و نہ مسلماں بہ حیرتم کہ مرا سوائے دوزخ و مینو کجا گذار افتد

یہ شعر تمھارا بہت خوب ہے، آفرین!

قرار در وطن افسردہ می کند دل را خوشا غریب کہ دور از دیارِ یار افتد

یہاں بھی افتد صحیح و بامعنی۔

نیم رقیب کہ رسوائیم خجل نہ کند خوش است پیشم اگر یار پردہ دار افتد

یہاں بھی "افتد" بمعنی واقع شود۔

ترا کہ شیوہ دگرگوں کنی بہ رغم بتاں خوش است اگر ز جفا بر وفا قرار افتد

"افتد" یہاں بھی ٹھیک ہے۔ بات اتنی ہی تھی کہ "بود" گدلا لفظ تھا۔ "کنی" صاف ہے۔

خطا ز رخِ تو بہ دل دادہ خطا آزاری خوشم کہ در شکنِ زلف تابدار افتد

وہ صورت اچھی نہ تھی، یہ طرز خوب ہو گئی۔ معنی کا عیار کامل ہو گیا۔

چکد ز خامہ جوہر سخن چناں کہ مگر بزور موجِ دُر از بحر بر کنار افتد

دولت و اقبال روز افزوں روزی باد

نگاشتۂ شنبہ، نہم اپریل سنہ ۱۸۵۳ء از اسد اللہ

(خطوطِ غالب صفحات ۱۶۹/۱۷۱)

مکتوبات بنام

میر مہدی حسین مجروح

بھائی!

تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ جو ماجرا میں نے سنا تھا وہ البتہ موجب تشویش تھا تمھاری تحریر سے وہ تشویش رفع ہو گئی۔ پھر تم کیوں ہائے وادیلا کرتے ہو؟ اوپر کا حکم موافق ہے ماتحت کا حکم جو مخالف تھا سو گیا پھر کیا قصہ ہے۔

"قاطع برہان" کے مسودے میں نے سب پھاڑ ڈالے اس واسطے کہ ہر نظر میں اس کی صورت بدلتی گئی وہ تحریر بالکل مغشوش ہو گئی۔ ہاں اس کی نقلیں صاف کہ جس میں کسی طرح کی غلطی نہیں، نواب صاحب نے کرلی ہے۔ ایک میرے واسطے ایک بھائی ضیاء الدین خان کے واسطے۔ میری ملک کی جو کتاب ہے اس کی جلد بندھ جائے تو بہ طریق مستعار بھیج دوں گا۔ تم اسکی نقل لے کر میری کتاب مجھ کو پھیر دینا اور یہ امر بعد محرم واقع ہوگا مگر یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے۔ صرف "برہان قاطع" کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہونگی وہ اس کو مانے گا۔ پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو، تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو اساتذہ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو، اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور

اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔

"فہمایش" کا لفظ میاں بدھا ولد جما اور لالہ گنیش داس ولد لالہ بھرو ناتھ کا گھڑا ہوا ہے۔ میری زبان سے کبھی تم نے سنا ہے؟ اب تفصیل سنو: امر کے صیغہ کے آگے شین آتا ہے تو امر معنی مصدری دیتا ہے اور اس کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں "سوختن" مصدر "سوزد" مضارع "سوز" امر "سوزش" حاصل مصدر۔ اسی طرح ہیں "خواہش" و "کاہش" و "گزارش" و "گدازش" و "آرایش" و "پیرایش" و "فرمایش"۔ "فہمیدن" فارسی الاصل نہیں ہے۔ مصدر جعلی ہے۔ "فہم" لفظ عربی الاصل ہے۔ "طلب" لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافق قاعدہ تعریس "فہمیدن" و "طلبیدن" کر لیا ہے۔ اور اس قاعدہ میں یہ کلیہ ہے کہ لغت اصلی عربی اخیر کو امر بن جاتا ہے۔ "فہم" یعنی "بفہم" "سمجھ"، "طلب" یعنی "بطلب" "مانگ" "فہمد" مضارع بنا "طلبید" مضارع بنا۔ خیر یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل مصدر کیوں نہ بنائیں۔ سنو حاصل بالمصدر "فہمش" اور "طلبش" چاہیے۔ "فہم" تھا صیغہ امر "فہمد" میں سے نکلا تھا۔ الف اور یے کہاں سے لایا؟ "فہمائے" تو نہیں جو "فہمایش" درست ہو کہیں مضارع "فرمائے" امر حاصل مصدر۔ "فرمایش" زیادہ زیادہ۔

پہلے حکیم میر اشرف علی کو دعا اور بیٹا پیدا ہونے کی مبارک باد۔ میاں میں نے رات کو اپنے عالم سرخوشی میں تاریخی نام کا خیال کیا "میر کاظم دین" کے بارہ سو پچھتر ہوتے ہیں لیکن یہ اسم بھی مانند لفظ "فہمایش" ٹکسال باہر ہے۔

جولائی ۱۸۵۹ء

(خطوط غالب صفحات ۳۰۵/۳۰۷)

بھائی!

کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روزہ بازار مسجد جامع کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلا پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس کا نام تھا۔

نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ ردسمبر کو یہاں داخل ہوں گے، دیکھیے کہاں اترتے ہیں، آگے کے دربار میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڈھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔ جو باقی رہے اس میں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کا کمشنر ان دونوں کو یہاں لے آیا تو تین رئیس، ورنہ ایک رئیس۔ بس۔ رہے دربار عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین۔ بلّی ماروں میں سگ دنیا موسوم بر اسد، تینوں مردود، مطرود، محروم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام اگر برسا کرے

تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچہ کا ڈھینا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ۔ غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا۔ حکیم الملک حکیم میر اشرف علی کو دعا قطب الملک میر نصیر الدین کو دعا۔ یوسف ہند میر افضل علی کو دعا۔

مرقومہ صبح جمعہ ۶ جمادی الاوّل

۲ دسمبر سال حال سنہ ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء

خطوط غالب ۳۱۰/۳۱۱

بے مے نہ کند در کف من خامہ روائے
سرد است ہوا آتش بے درد کجائے[1]

صبح کا وقت ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعہ[2] پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی دل توانا ہو گیا دماغ روشن ہو گیا نفس ناطقہ کو تواجد[3] بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ہائے غضب! ہائے غضب

میاں تم پنسن پنشن کیا کر رہے ہو؟ گورنر جنرل کہاں، اور پنشن کہاں، ڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر، لفٹنٹ گورنر بہادر جب ان تینوں نے جواب دیا ہو، تو اس کا مرافعہ[4] گورمنٹ میں کروں مجھے تو دربار خلعت کے لالے پڑے ہیں تم کو پنشن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام دربار کی فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل لفٹنٹ گورنر کے ہاں کیا ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو گا تم کو لکھا جائے گا۔

سہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

اقتباس خطوط غالب ۳۱۱

---

[1] یہ شعر عود ہندی صفحہ ۱۲۹ پر اس طرح درج ہے جو صحیح ہے۔ بے مے نکند در کف من خامہ روانی
سرد است ہوا آتش بے دود کجائی۔ یعنی بغیر شراب کے میرے ہاتھ سے قلم نہیں چلتا۔ ٹھنڈی ہوا
چل رہی ہے لے بے دھوئیں والی آگ (یعنی شراب) تو کہاں ہے (عود ہندی صفحہ ۱۲۹)
[2] گھونٹ [3] وجد [4] اپیل

جانِ غالب،

تمھارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے۔

ہر ایک سے پوچھتا ہوں وہ کہاں ہے؟

مصرع بدل دینے سے یہ شعر کس رتبہ کا ہو گیا!

اے میر تمہاری تجھے شرم نہیں آتی

میاں یہ اہلِ دہلی کی زباں ہے

ارے اب اہلِ دہلی یا ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے؟ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔

حسن کی ٹٹی بر دا ہوا اب کہاں؟ لطف تو اُسی مکان میں تھا اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال گرمی گزرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا مسجد جامع سے لیکر راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس

جانب کو کسٹم ہاؤس نشیب تھا اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فیصل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی دروازہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔

اللہ اللہ دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسن اعتقاد ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں؟ دلی واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ حلقہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر الور کا حال کچھ اور ہے مجھے اور انقلاب سے کیا کام۔ الکزنڈر ہدرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔

میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیر الدین کو دعا۔

۱۸۶۱ء

مخطوط غالب صفحات ۳۱۸ / ۳۱۹

سیّد صاحب!

وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں بھی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی، مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفعِ فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔ "کلیاتِ اردو" کا چھاپہ تمام ہوا۔ اغلب اسی ہفتے میں، غایت اسی مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچے۔ "کلیاتِ فارسی" کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو وہ بھی چھاپا جائیگا۔ "قاطع برہان" کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھا دیے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا تو میں بے شرکتِ غیر اُس کو چھپواؤں گا مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال "مجتہد العصر" کو معلوم ہے۔ واللہ علی کل شئی قدیر۔ خدا کا بندہ ہوں۔ علی کا غلام ہوں۔ میرا خدا کریم۔ میرا خاوند سخی۔

علی دارم، چہ غم دارم؟

۱۲۷۸ھ ۱۸۶۱ء

اقتباس خطوط غالب صفحات ۳۲۳
۳۲۴

آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی

بہت دنوں میں آئے کہاں تھے؟ بارے آپ کا مزاج خوش ہے۔ میر سرفراز حسین صاحب اچھی طرح ہیں۔ میرن صاحب خوش ہیں؟

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

پہلے یہ سمجھ لو کہ قسم کیا چیز ہے۔ قد اس کا کتنا لمبا ہے۔ پانوں کیسے ہیں۔ رنگ کیسا ہے جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں۔ ایک اعتبار محض ہے۔ وجود اس کا صرف تعقل میں ہے۔ سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے۔ یعنی کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں۔ پس شاعر کہتا ہے کہ جب اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے۔

می خواہم از خدا و نمی خواہم از خدا
دیدن حبیب را و ندیدن رقیب را

لف و نشر مرتب ہے۔ می خواہم از خدا دیدن حبیب را۔ نمی خواہم از خدا ندیدن رقیب را۔ خوار و زار و خستہ و سوگوار۔ معنی تو اس میں موجود ہیں مگر بول چال ٹکسال باہر ہے۔ ایک جملے کا جملہ مقدر چھوڑ دیا ہے اور پھر اس بھونڈی طرح سے کہ جس کو "المعنے فی بطن الشاعر" کہتے ہیں۔ یہ شعرا اساتذۂ مسلم الثبوت میں

سے کسی کا نہیں کوئی صاحب ہوں گے کہ انھوں نے لوگوں کے حیران کرنے کے واسطے یہ شعر کہہ دیا اور کسی استاد کا نام لے دیا کہ یہ اُن کا ہے ۔

تذکیر و تانیث کا کوئی قاعدہ منضبط نہیں کہ جس پر حکم کیا جائے۔ جو جس کے کانوں کو لگے جس کا دل قبول کرے اوس کہے۔ "رتھ" میرے نزدیک مذکر ہے یعنی رتھ آیا لیکن جمع میں کیا کرونگا؟ ناچار مؤنث بولنا پڑیگا یعنی رتھیں آئیں۔ خیر مؤنث ہے بہ اتفاق مگر "کاغذ اخبار" اس کو خود سمجھ لو کہ تمھارا دل کیا قبول کرتا ہے۔ میں تو مذکر کہوں گا۔ یعنی اخبار آیا۔ پیر ہوئی یا ہوا یہ منطق عوام کا ہے ہمیں اس سے کچھ کام نہیں۔ ہم کہیں گے کہ دوشنبہ ہوا۔ پیر کا دن ہوا۔ نری پیر ہوئی یا پیر ہوا ہم کیوں بولیں گے؟ بلبل میرے نزدیک مؤنث ہے جمع اوس کا بلبلیں۔ طوطی بولتا ہے۔ بلبل بولتی ہے۔ بھائی اس امر میں میں مجتہد نہیں بن سکتا۔ اپنا عندیہ لکھتا ہوں۔ جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے۔

نجات کا طالب غالب

سہ شنبہ ۸ر دسمبر ۱۸۶۳ء

خطوط غالب صفحات ۳۳۵/۳۳۶

میری جان!

وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی اوس میں خُر بہ خائے مفہوم "نورِ قاہر" کو کہتے ہیں اور چونکہ پارسیوں کی دید و دانست میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے اس واسطے آفتاب کو "خُر" لکھا اور "شید" کا لفظ بڑھا دیا۔ "شید" بکسور و یائے معروف بروزن عید "روشنی" کو کہتے ہیں یعنی یہ اوس "نورِ قاہر ایزدی" کی روشنی ہے "خُر" اور "خورشید" یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھہرے۔ جب عرب و عجم مل گئے تو اکابر عرب نے کہ وہ منبع علوم ہوئے واسطے رفع التباس کے خُر میں واؤ معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ متاخرین نے اس قاعدے کو پسند کیا اور منظور کیا اور فی الحقیقت یہ قاعدہ بہت مستحسن ہے۔ فقیر وہ خُر جہاں بے اضافہ لفظ شید لکھتا ہے موافق قانون عظمائے عرب بہ واؤ معدولہ لکھتا ہے یعنی خور اور جہاں بہ اضافہ لفظ شید لکھتا ہے وہاں بہ پیروی بزرگان پارسی سر بسر لفظ خُر کو بے واؤ لکھتا ہے یعنی خُرشید۔ خُر کا قافیہ در اور بر کے ساتھ جائز اور روا ہے۔ خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا۔ وہاں میں بے واؤ کیوں لکھوں؟ رہا خورشید چاہو بے واؤ لکھو چاہو مع الواؤ لکھو۔ میں بے واؤ لکھتا ہوں مگر مع الواؤ کو غلط نہیں جانتا اور خُر کو کبھی بے واؤ نہ لکھوں گا۔

قافیہ ہو یا نہ ہو یعنی نظم میں وسط شعر میں آپڑے یا نثر کی عبارت میں واقع ہو۔ "خود" لکھونگا۔ یہ بات تم کو معلوم رہے کہ جس طرح خم ترجمہ قاہر کا ہے اسی طرح جم ترجمہ قادر کا ہے کہ بہ اضافۂ لفظ شید امم شہنشاہ وقت قرار پایا ہے۔

مجتہد العصر میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ سچ کہنا تمھیں وہاں کوئی مجتہد العصر نہ کہتا ہوگا۔ نہ کہو، تم کو کیا؟ میں نے تم نے مان لیا اب کوئی کہے یا نہ کہے میاں بدر الدین سے ایک مہر کھدوا دونگا۔

"جناب مجتہد العصر سرفراز حسین"

بس تم یہ مہر خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر کرنی شروع کرنا سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنے لگیں گے۔

حکیم میر اشرف علی اور ان کے فرزند کو دعا پہنچے۔ میرن صاحب کو دعا پہنچے۔ بھائی میرن اب وہ خس کا پردہ کھول ڈالا۔ صافیاں جھجھر پر لپٹیا ہوں۔ دم بدم بھگوتا ہوں۔ وہ تو کہاں جو پردے سے لپٹ کر صافی کو لگے آکر اور پانی کو ٹھنڈا کرے؟ وہ پانی جو میر مہدی اور تم اور حکیم جی پیا کیے ہو اب کہاں؟ برف پندرہ دن کی اور باقی ہے آئندہ خدا رازق ہے

خطوط غالب صفحات ۳۳۷ / ۳۳۸

قرۃ العینین میر مہدی و میر سرفراز حسین

مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا

ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں[1]
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے

مدعا یہ ہے کہ تمھارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا۔ میں جس کا جواب لکھتا میرن صاحب سے تمھاری خیریت پوچھتی اور کہہ دینا کہ میری دعا لکھ بھیجنا۔ بس اتنا ہی دم باقی ہے۔ کل میرن صاحب آئے پوچھا کہ ادھر سے کوئی خط آیا؟ فرمایا کہ اس ہفتے میں کوئی خط میں نے نہیں پایا۔ کیا کہوں کیا حال ہے؟ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

---

[1] اسی غزل میں ایک قطعہ بند ہے۔ جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں۔ غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا جبکہ ساری دنیا میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کسی شے میں اور کوئی موجود نہیں یعنی پنہاں نہیں ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے یعنی یہ دیر و حرم ناقوس و اذاں سبحہ و زنار اور کلیسا و میخانہ اور من و تو کی بحث آرائی کیوں ہے؟ (عارف)

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذّت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

اب اس زمرے کا محل نہ رہا یعنی سعیٔ بے حاصل کی لذّت خاک میں مل گئی انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون ۔

سہ شنبہ ۱۸ شعبان ۱۲۸۱ھ ۱۷ جنوری ۱۸۶۵ء

مرگِ ناگاہ کا طالب غالب

خطوطِ غالب صفحہ ۳۳۸

مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے۔ اس فلک کج رفتار کا برا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے ایک گوشہ و توشہ تھا چند مفلس بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے۔

وہ بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک فقط دیکھنا

یاد رہے کہ یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ صاحب اب تم ہی بتاؤ میں تم کو کیا لکھوں وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی یہ تحریر تلافی اس تقریر کا نہیں کر سکتی بہر حال جو کچھ لکھتا ہوں دیکھو کیسا لکھتا ہوں۔

نوٹ آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں۔

...... تم نے وہ میر کا مقطع سنا ہوگا بہ تغیرّ الفاظ لکھتا ہوں

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں

دلّی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر کا مقطع یوں ہے:

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں

اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

میر کی جگہ میرن اور رہا کی جگہ بچا کیا اچھا تصرّف ہے۔

(عود ہندی صفحات ۱۲۱/۱۲۲)

میری جان!

خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو؟ اس کی وجہ میں نہیں سمجھا۔ تمہارا خط آئے اور جواب نہ لکھوں تو گنہ گار۔ نواب یوسف علی خان ناظم کا دیوان میرے پاس کہاں؟ نواب صاحب نے بہ سبیل ارمغان مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا۔ یہاں کچھ بکتے آ گئے تھے۔ میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفیٰ خان کو جہانگیر آباد بھیجا تھا اور محمد بخش اور میر جی سے کہہ دونگا اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد میر سرفراز حسین کو بھیجدونگا۔ توقع نوکری کا حال مجھ کو مفصل معلوم ہے۔ یہ بھی بادشاہی تنخواہ ہوئی کہ روپیہ دے کر مول لیں اور کہیں کہ ہم نے نذرانہ دیا ہے۔ بشرطِ نوکری ہو جانے کے۔ برس چھ مہینے تک اپنا دیا ہوا روپیہ مسترد کرنا ہوگا۔ نوکری مفت ہیں۔

"مقدر" مذکر اور "تقدیر" مؤنث ہے۔ کون کہے گا: فلانے کی مقدر اچھی ہے؟ کون کہے گا ڈھکے کا تقدیر برا ہے؟ یہ مسئلہ صاف ہے۔ تذبذب نہیں۔ کوئی بھی "مقدر" کو مؤنث نہ کہتا ہوگا تم کو تردد کیوں ہوا؟

"جواں مرد" "جواں بخت" "جوان دولت" "جواں عمر" "جوان سال" "جواں خرد" "جواں مرگ" یہ الفاظ مقررہ اہلِ زبان ہیں کبھی منقلوب و معکوس نہیں آئے۔

"اودھ اخبار" میں بادشاہ کے مرنے کی خبر لکھی دیکھی۔ مگر پھر کہیں سے تصدیق

نہیں ہوئی۔ نرندر سنگھ راجہ پٹیالہ بے تکلف مر گیا۔ مسجد جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے۔ اگر سچ ہو جائے تو کیا دور ہے؟ شاہ اودو کی املاک کی بھی واگذاشت کی خبر ہے۔

لو کہو اب اور کیا لکھوں؟ سرراہ کی منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے اوس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔ بس اب یہ لکھنا باقی ہے، کہ "مجتہد العصر" کو دعا اور میر افضل علی صاحب کو دعائیں۔

صبح پنجشنبہ ۲۷ جمادی الاول ۲۰ نومبر سال حال

(۱۲۷۹ھ - ۱۸۶۲ء)

خطوط غالب صفحات ۳۳۲-۳۳۳

مکتوب بنام

منشی شیو نرائن نگم آرام

صاحب! میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے۔ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو تم اور اکمل تھے وہ لٹ گئے یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں یکتا ہو انظر آجائے لے لو۔ تم کو لکھ بھیجا اور ایک بات اور تھارے خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی جس غزل کی تم نے پانچ شعر لکھے ہیں یہ نو شعر کی ہے۔ ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچائے ہیں۔ چنانچہ یہاں ہو گئیں۔ ویران ہو گئیں یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے اب میں نے اس کو لکھا ہے اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ کر رکھے دوں گا جب اس کے پاس سے ایک غزل یا دو غزل آجائے گی تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا یہ خط یا آج روانہ ہو جائے گا یا کل۔ میں نے ایک قصیدہ اپنے محسن و مربی قدیم جناب فریڈرک اڈمنسٹن جناب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ جناب منٹگمری لفٹنٹ گورنر بہادر ملک پنجاب کی تعریف میں لکھا ہے اگر کہو تو یہ بھیج دونگا۔ مگر فارسی ہیں اور چالیس چالیس پینتالیس پینتالیس شعر ہیں۔ کتب دستنبو کے بک جانے سے میں خوش ہوا خدا کرے جس کو دی ہو وہ تین غلطیاں جو معلوم ہیں وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندستانیوں نے لیں۔ یہ بات

مجھ کو ضرور ضرور لکھو۔ دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی بھائی ہندستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں اُن میں سیکڑوں بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبان انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی۔ میاں میں تم کو اپنا فرزند جانتا ہوں۔ خط لکھنے نہ لکھنے پر موقوف نہیں ہے۔ تمھاری جگہ میرے دل میں ہے اب میں طبع آزمائی کرتا ہوں۔ جو غزل تم نے بھیجی ہے اس کو لکھتا ہوں خدا کرے نو کے نو شعر یاد آ جائیں۔ غزل

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قایل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
دگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
دگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہ تمھارا اقبال ہے کہ نو شعر یاد آ گئے۔ ایک غزل یہ اور دو غزل وہ جو آیا چاہتی ہیں تین ہفتہ کا گودام تمھارے پاس فراہم ہو گیا۔ اگر منگواؤ گے تو قصیدے بھی بھیج دوں گا۔ مرقومہ سہ شنبہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء۔

(اردوئے معلیٰ صفحات ۳۵۷/۳۵۸)

مکتوبات بنام

قاضی عبدالجلیل جنوںؔ

صاحب!

وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے مجھ کو پہنچا اور میں نے اوس خط کا جواب تم کو بھیجا اور ذکر اشعار قلم انداز کیا۔ فارسی کا کیا لکھوں یہاں ترکی تمام ہے اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں مرنا سر پر کھڑا ہے پا بر رکاب ہوں۔ طرح بالفتح بمعنے نمونہ اور بمعنی قریب سیج لیکن بفتحتین اور چیز ہے غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا ناقل ناعاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا اوس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا۔ مصرعہ

کیستم من کہ تا ابد بزنم

لاحول ولاقوۃ یہ مصرع میرا نہیں۔ تا ابد بزنم۔ یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے۔ قطعہ۔

^1 کیستم من کہ جاوداں باشم	چوں نظیری نماند طالب مرد
در بگویند در کدامیں سال	مرد غالب۔ بگو کہ غالب مرد

یہ مادۂ تاریخ از روے نجوم نہیں بلکہ از روے کشف ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پنجشنبہ ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء غالب (عود ہندی صفحہ ۲۳۲)

(خطوط غالب صفحات ۱۸۲/۱۸۳

---

^1 میں کون ہوں کہ ہمیشہ زندہ رہوں جب نظیری نہ رہا اور طالب مرگیا۔ اور اگر یہ پوچھیں کہ غالب کون سے سن میں مرا تو غالبؔ مُرد انس سے کہہ دینا۔ ۱۲۔

پیر و مرشد

فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے جو حکم آپ کا ہوتا ہے اوس کو بجا لاتا ہوں مگر معدوم کو موجود کرنا میری وسع قدرت سے باہر ہے۔ اس زمین میں جس کا اپنے قافیہ و ردیف لکھا ہے۔ میں نے کبھی غزل نہیں لکھی۔ خدا جانے مولوی درویش حسن صاحب نے کس سے اوس زمین کا شعر سن کر میرا کلام گمان کیا ہے۔ ہر چند میں نے خیال کیا۔ اس زمین میں میری کوئی غزل نہیں۔ دیوان ریختہ کا یہاں کہیں کہیں ہے۔ اپنے حافظہ پر اعتراض نہ کرنا اوس کو بھی دیکھا۔ وہ غزل نہ نکلی۔ سنیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دنوں ایک صاحب نے مجھے آگرہ سے لکھا کہ یہ غزل بھیج دیجیے۔

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

میں نے لاحول ولا قوۃ کہا۔ اگر یہ کلام میرا ہوتا تو مجھ پر لعنت۔ اسی طرح زمانۂ سابق میں ایک صاحب نے میرے سامنے یہ مطلع پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اوس پر بقول اوس کے

خدا کی رحمت اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر اور بت اور خدا اور جفا اور وفا یہ میری طرز گفتار نہیں ہے۔ بھلا ان دو شعروں میں تو اسد کا لفظ بھی ہے۔ وہ شعر میرا کیوں سمجھا گیا؟ واللہ باللہ وہ شعر "خدنگ" "زنگ" کے قافیہ کا میرا نہیں ہے۔ والسلام

رسلاد جمعہ ۲۵ ماہ صیام ۱۲۷۵ھ ۲۹ اپریل سال حال ۱۸۵۶ء

خطوط غالب صفحات ۱۸۰/۱۸۱

حضرت!

کیا ارشاد ہوتا ہے۔ آگے اس سے جواب کے اشعار آئے تھے وہ دو دن کے بعد اصلاح دے کر بھیج دیے۔ خط ڈاک میں تلف ہو جائے تو میرا کیا گناہ۔ آج آپ کا یہ خط صبح کو آیا۔ میں نے آج ہی دوپہر کو دیکھ کر لفافہ کر کر ڈاک میں بھجوا دیا۔ اب پہنچے یا نہ پہنچے۔

دو باتیں سنیے۔ "طرح" بہ سکون رائے قرشت بہ معنی "فریب" ہے لیکن اردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں۔ وہ دوسرا لغت ہے۔ "طرح" بہ حرکت رائے قرشت بروزن "فرح"، اوس کو بہ سکون رائے (مہملہ) بولنا عوام کا منطوق ہے۔ معاذ اللہ اگر تقریر میں اس طرح یعنی بہ سکون بولوں تو (زبان اپنی) کاٹ ڈالوں۔ چہ جائے آں کہ نظم میں لاؤں۔ ہاں "غزل" طرح کی زمین طا (رح کی) یہ بہ سکون ہے اور بمعنی روش و طرز طرح ہے بہ فتحتین۔

د(استان ....) افسانہ نہیں "دستان" کے تین معنی: ایک تو رستم ہزار داستان کہتے ہیں سوتی اور فرمایہ (لوگ کہتے) ہیں۔ صحیح ہزار دستان "یعنی بہت طرح کی آواز بولتا ہے"[1]۔ جناب مولوی احمد حسن صاحب "عرشی" کو میرا سلام پہنچے۔

یکشنبہ ۲۸ راگست ۱۸۵۹ء (خطوط غالب صفحات ۱۸۱/۱۸۲

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

لہ عودمیں یہ خط ناقص ہے اصل خط کا کاغذ بوسیدہ ہے کچھ نقط غائب ہیں کچھ پڑھے نہیں جاتے دوسرے رخ پر جنوں کے قلم کے لکھے ہوئے پانچ اخیر شعر ایک فارسی غزل کے اوس کے بعد تین غزلیں اُردو کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو ورقے کا پہلا ورق ضائع ہوگیا۔ پانچ فارسی شعروں میں سے بہت کچھ ضائع ہو چکا ہے، مگر غالب نے ایک شعر عطا فرمایا ہے ؎

نالۂ بلبل کجا باشد چنیں
می چکد خونِ دل از دستانِ من

اور اردو شعر کو قلمزد کر دیا ہے ؎

یاں بھی چھوڑا نہیں ہم کو شبِ تنہائی نے
پہلوئے گور سے کس طرح کنارا کیجے

(خطوط غالب مرتبہ مالک رام صفحہ ۱۸۲)

حضرت! بہت دنوں میں آپ نے مجھ کو یاد کیا۔ سال گزشتہ ان دنوں میں رامپور میں تھا مارچ ۱۸۶۰ء میں یہاں آگیا ہوں۔ اب یہیں میں نے آپ کا خط پایا ہے۔ آپ نے سرنامہ پر رام پور کا نام ناحق لکھا۔

حق تعالیٰ والئ رام پور کو صد وسی سال سلامت رکھے۔ ان کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو پہنچتا ہے۔ کرم گستری و استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اٹھانے کی اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔

مولوی احمد حسن "عرشی" کے فراق کو میں نہیں سمجھا کہ کیوں واقع ہوا۔ بلکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ اور وہ یکجا کہاں تھے اور کب تھے؟ خلیفہ حسین علی صاحب رام پور میں مجھ سے ملے ہوں گے مگر واللہ مجھ کو یاد نہیں۔ نسیان کا مرض لاحق ہے۔ حافظہ گویا نہ رہا۔ شامہ ضعیف، سامعہ باطل، باصرہ میں نقصان نہیں۔ البتہ حدت کچھ کم ہو گئی ہے۔

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

بہر حال چونکہ دلی میں ہوں اور وہ رام پور گئے ہیں، تو البتہ وہ آپ کے پیام جو ان کی زبان کے محوّل تھے بدستور ان کی تحویل میں رہے اور مجھ تک نہ پہنچے۔

یہ شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ امکنہ، کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت

عالی میں بھیج دیا جائے گا۔

لہ دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت الخ

ایک دوست کے پاس تعبیتہ الہنب والقارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے اس سے یہ غزل لکھ کر بھیج دوں گا۔

دلی میں ایک حکیم تھے ان کا نصراللہ خاں نام تھا وہ مر گئے اس نام کا وکیل عدالت دیوانی کبھی میں نے نہیں سنا۔ کیسا ڈیڑھ پور، کیسا کان پور، اب میں کس سے پوچھتا پھروں کہ نصراللہ کے تم شناسا ہو، یا نہیں؟ جب حضرت کو اون کا مسکن مع عہدہ معلوم ہے تو پھر اون کے احباب کو کیوں ڈھونڈھتے ہو؟ غزلیں بعد اصلاح کے پہنچتی ہیں۔ نجات کا طالب غالب

"تنگ پانوں" واو کے ضمے کو اشباع کیسا؟ یہ تو ترجمہ پابم کا ہے اور پھر "پاؤں" کی یہ املا غلط ہے "پانو" "گانو" "چھانو" "گھنیٹے گا" نون کیسا؟ —— "گھسیٹے گا" اس کا املا یوں ہے۔

۲۲ر فروری ۱۸۶۱ء خطوط غالب

صفحات ۱۸۳/۱۸۴

لہ یہ غزل جس میں ۱۹ اشعار ہیں دلی اردو اخبار میں ۱۳ر فروری ۱۸۵۳ء میں چھپی تھی۔ اس غزل پر مرزا نورالدین شاہی نے ایک مخمس میں کہ جس کے آخر کے دو مصرعوں میں غالب کا پورا شعر باندھا تھا۔ متذکرہ مخمس بہت پسند کیا گیا اور بہادر شاہ ظفر نے پانچ بار اس کو پڑھوا کر سنا۔ (مرتب)

.......سلامت، یہ عہدہ آپ کو مبارک ہو اور مجھ کو اسی طرح صدر الصدوری کے منصب کی مبارک باد لکھنی نصیب ہو۔ غزلیں دیکھ کر بھیجتا ہوں۔ اب کے اصلاح کی حاجت کم پڑی۔

"بردہ"، "رفتہ" یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں یائے تحتانی نہیں لکھتے۔ بس وہی ہائے اثنائے حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے تو "رفتہ"، "بردہ" اس صورت پر رہے گی۔ اور اگر اس کو حرکت لازم آئے، علامت حرکت ہمزہ لکھ دیا جائے۔ "رفتہ"، "آمدہ" اور ان مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے "پان" کا شعر کاٹ ڈالا وجہ یہ کہ پہلے تو میں "پان" کا نون بے اعلان، بروزن "آن" پسند نہیں کرتا۔

(خطوط غالب صفحات ۱۸۴/۱۸۵)

"خستہ کام" و "اندیشہ کام" دونوں لفظ ٹکسال باہر ہیں۔ ہاں "ناکام"
اور "دشمن کام" و "دوست کام" لکھتے ہیں "تشنہ کام" اور ترکیب میں "کام"
بہ معنی "تالو" کے ہیں نہ بہ معنی "مقصد و مدعا"

کاغذ لفافہ میں اس طرح لپیٹا کیجیے کہ کھلنے کی جگہ باقی رہے۔

(خطوطِ غالب صفحہ ۱۸۶)

"تڑپھنا" ترجمہ تپیدن کا املا یوں ہے۔ نہ "تڑپنا" بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے۔

"معشوق کو "صاحب" لکھنا چاہیے نہ کہ حضرت اور جو ایک دو جگہ اصلاح ہے اس کی توضیح کی حاجت نہیں۔ فارسی غزل، خیر اگر آپ کا جی چاہے تو رہنے دیجیے۔ جس طرح اس میں کہیں سقم نہیں۔ اسی طرح لطف بھی نہیں۔

نجات کا طالب غالب
(خطوط غالب صفحہ ۱۸۶)

"زیروں خانہ" کا لفظ خلاف روزمرہ۔ علاوہ اس سے، یہ احتمال ہوتا ہے کہ مگر خود اوس شخص کے گھر میں دخل غیر ہے:

(خطوط غالب صفحہ ۱۸۶)

مہ شوال کو کیا دیکھے جنونِ غمگیں
خنجرِ ناز نہیں ابروئے خمدار نہیں

پیر و مرشد: ماہِ شوال کو خنجر و شمشیر سے کیا علاقہ؟ ہلال رمضان دیکھ کر تلوار کو دیکھتے ہیں اور ہلال شوال کو دیکھ کر سبز کپڑا مشاہدہ کرتے ہیں۔
اشعار بہت ہیں۔ ان میں سے کسی کو مقطع کر دیجیے۔

غالب

ہفتم فروری ۱۸۶۴ء

(خطوطِ غالب صفحہ ۱۸۸)

حضرت!

غزل سراسر ہموار و ذوق انگیز ہے۔ ایک شعر میں ایک لفظ بنایا گیا ایک شعر کا پہلا مصرع بدل دیا گیا۔

مومن خاں کے اس مصرع میں تردد کیا ہے؟

تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

"سے" بمعنی "از" نہیں ہے بلکہ بمعنی "مثل" "مانند" ہے چوں تو دشمن اگر تہنیت دہد بر آں چہ اعتبار؟

وصل کے وعدہ سے ہو دل شاد کیا
تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

یعنی اگر تم نے کہا کہ تو مبارک ہو کل ہم آئیں گے یا تمھیں بلائیں گے۔ ہم ایسے وعدے سے کیا خوش ہوں گے؟ تم جیسے دشمن کے مبارکباد دینے سے کیا ہوتا ہے۔

۱۹ر مارچ ۱۸۶۴ء غالب

(خطوط غالب صفحہ ۱۸۸)

حضرت سلامت!

میاں قدرت اللہ صاحب کا تردد بجا "پیش از صبح صادق" نماز کیسی؟ یہ کاتب اول کی خوبی اور نقل کرنے والوں کی غفلت ہے اصل فقرہ یوں ہے:

"خود بدولت پیش از صبح صادق برخاستہ بعد بانگ صلوٰۃ با جماعت فضلا نماز صبح ادا کردہ بہ جھروکہ درشن تشریف می آوردند"

حضرات نے "بہ نفس نفیس" بڑھایا اور "برخاستہ" کو بہ جبر اٹھا دیا۔ صبح صادق سے پہلے یعنی دو تین گھڑی رات رہے اٹھتے اور ضروریات سے فراغت کرتے وضو کے مراسم بجالاتے جب مؤذن اذان دیتا جماعت کی نماز پڑھتے جوائج ضروری کو "برخاستہ" کے بعد چھوڑ جانا بلاغت ہے۔ یعنی اوس وقت کے افعال بول و براز ہیں ان کا ذکر مکروہ طبع ہے عموماً اور بہ نسبت بادشاہ سوء ادب ہے خصوصاً اور یہ جو فقیر "بہ نفس نفیس" کو غلط کہتا ہے یہاں ایک دقیقہ ہے یعنی بہت کام ایسے ہیں کہ آدمی آپ بھی کر سکتا ہے اور خادم سے بھی لے سکتا ہے مثلاً "چلم پر آگ دھرنا" یا پائخانہ میں لوٹا لے جانا اور بہت کام ایسے ہیں کہ ہر شخص کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں دوسرا اپنا تا نہیں کر سکتا مثلاً "حقہ پینا یا پائخانہ جانا سونا، جاگنا اٹھنا، بیٹھنا، بھی اسی قبیل سے ہے۔ پس افعال مشترکہ میں "بہ نفس نفیس" لکھ سکتے ہیں اور افعال مخصوصہ میں "بہ نفس نفیس" کی قید لغو اور پوچ اور مہمل ہے۔ میں

کیا کروں؟ فی الحال دودمان معنی کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا۔ جہلا جانتے ہیں۔ علماء اعتنا نہیں کرتے۔ چھاپہ کو توقیع الٰہی سمجھتے ہیں۔ نسخہ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے، کاپی نویس کے جرم میں مصنف بیچارہ ماخوذ ہوتا ہے۔

۸ / مئی ۱۸۶۴ء

داد کا طالب غالب
(خطوط غالب صفحہ ۱۸۹)

جناب عالی!

وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم
مدعا یہ کہ گم ہو گئی۔

گھات میں مدعا برآری کی
ہم نے غیروں کی غمگساری کی

تقدیم تاخیر مصرعین کر کے رہنے دو اس میں کوئی سقم نہیں۔ "مدعا برآری" کا ٹھوں
کا لفظ ہے میں اس طرح کے الفاظ سے احتراز کرتا ہوں مگر چونکہ من حیثیت المعنی
یہ لفظ صحیح ہے مضائقہ نہیں۔

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لطف زیادہ نہیں۔
قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے بقدر ایک قطرۂ مژہ برہم زدن ثبات و قرار ہے۔
حیرت ازالۂ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر
برابر بوندیں جو تھم کر رہ گئیں تو پیالی کا خط بصورت اوس تلگے کے بن گیا جس
میں موتی پردے ہوں۔

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

یہ بہت لطیف تقریر ہے "لیتا" کو ربط ہے "چین" سے "کرتا" مربوط ہے "آہ وفغاں" سے عربی میں تعقید لفظی و معنوی، دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے۔ بلکہ فصیح اور بلیغ۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ وفغاں کرتا۔

ملنا اگر نہیں ترا آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

یعنی اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکیگا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا، مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔

حسن اور اوس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں

مولوی صاحب! کیا لطف معنی ہیں؟ داد دینا۔ حسن عارض اور حسن ظن۔ دو صنعتیں محبوب میں جمع ہیں یعنی صورت اچھی ہے اور اوس کا گمان صحیح ہے، خطا کبھی نہیں کرتا اور یہ گمان اوس کو بہ نسبت اپنے ہے کہ میرا مارا کبھی نہیں بچتا اور میرا تیرِ غمزہ کبھی خطا نہیں کرتا پس جب اوس کو اپنے اوپر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اور حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کھایا تھا۔ رقیب عاشق صادق نہ تھا۔ ہوسناک آدمی تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان میں آتا تو حقیقت کھل جاتی۔

له تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو! اگر نامہ بر ملے

(حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہے۔ مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اوس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اوس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے میں ضامن ہوں کہ یہ شخص ایسی حرکت نہ کرے گا خیر اوس کے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب دیوانہ بن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعے کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ عیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر۔ اے ندیم۔ تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے تو اوس کو میرا اسلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس میں کوئی اشکال نہیں۔ جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا مقصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔

۲۴ راگست ۱۸۶۴ء

خطوط غالب صفحات ۱۹۰/۱۹۱

---

[۱] تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے — حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

غالب کی یہ غزل بڑی معرکہ کی ہے متذکرہ بالا مطلع پر جعفر علی خاں اثر مرحوم نے کئی صفحے قلمبند کیے ہیں جو لائق مطالعہ ہیں (مطالعہ غالب صفحہ ۲۱ — مرتب

مکتوب بنام

چودھری عبدالغفور سرورؔ

چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ میں سزاوار ستایش نہیں ہوں ایک سپاہی ہیچمداں بھی یاد رہے کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کے پرواز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پایا[1] گا اور حق بجانب میرے ہوگا پہلے میں حضرت سے پوچھتا ہوں کہ یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب ایزدی سروش[2] ہیں اور ان کا کلام وحی ہے آپ اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی نہیں کوئی کہہ سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے اسی چھاپے میں کہ جس کا آپ حوالہ دیتے ہیں۔

[3] منکہ باشم عقل کل .... الخ

اس شعر کی شرح ملاحظہ کیجیے عبارت و تعقید سے لبریز کہ مقصود شارح کا سمجھا بھی نہیں جاتا اور جب غور و تامل کے بعد سمجھ لیجیے تو وہ معنی ہرگز لائق اس کے نہیں ہیں کہ فکر سلیم اس کو قبول کرے۔ پھر

[4] احسان تو بشگافتہ ...... الخ

اس مصرع کی توجیہ کتنی بے مزہ اور بے معنی ہے عرفی کو کہاں سے لاؤں جو اس سے

---

[1] بضم اول و ثالث ہے گھر وہ بڑے لوگوں کا [2] فرشتہ یعنی جو منجانب خدا آواز دے [3] یہ عرفی کے قصیدہ کا ایک شعر ہے جس کی ردیف انداختہ ہے [4] یہ بھی عرفی کے قصیدے کا شعر ہے۔

پوچھوں کہ بھائی تو نے اس شعر کے کیا معنی رکھے ہیں قصہ کوتاہ۔ نظم

دیوان گری محبت تو کا حمد و زمسلم ست مارا
بیگانہ ز تاج کرد تارک آوارہ ز کفش کرد پارا

جیسا کہ دوسرے شعر کے مفہوم کو شارح کہتا ہے کہ دیوانگی میں یہ حالت بعید نہیں۔ ایسا ہی اگر کوئی کہے منصب دیوانی سے یہ بات بعید ہے تو پھر شارح کیا جواب دے گا۔ ہاں یہ کہے گا کہ غلبہ محبت میں پاس وضع نہ رہا اور دیوان جی صاحب کچہری سے ننگے سر اور ننگے پاؤں نکل بھاگے۔ ہم نے مانا مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ دیوانگی کیوں نہ لکھیں کہ دوسرے شعر کے معنی بے تکلف منطبق ہو جائیں اور توجیہات درمیان میں نہ آئیں فقیر کے نزدیک دیوانگی محبت تو صحیح اور بے تکلف ہے اور دیوانگی و محبت تو غلط محض اور دیوانگری محبت تو تکلف محض۔ دیوانگی اور محبت دو صنعتیں کیوں جمع کریں غور کیجے عطف واؤ یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص پہلے سے دیوانہ تھا اور پھر اوسی حالت میں اوس کو محبت پیدا ہوئی دیوانگی میں تاج و نقش بیجا تھی محبت پیدا ہونے کے بعد یہ حالت طاری ہوئی کیا بے مزہ توجیہ ہے ہاں دیوانگی محبت یعنی وہ جنون جو فرط محبت میں بہم پہنچا اوس نے اس احوال کو پہنچایا۔ فقیر دیوانگی محبت کہے گا اور دیوانگی محبت کہنے کو منع کریگا۔ دیوانگری محبت کہنے کو نہ مانع آئے گا نہ تسلیم کریگا زیادہ اس سے کیا عرض کروں یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجا لاتا ہوں اور بس۔

اب یہاں روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔ اپنے مخدوم و مطاع[1] حضرت صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں کہ اور کیا لکھوں یہ مدعا چودھری صاحب کی تحریر سے معلوم ہو گیا تھا اور اس کا جواب لکھا گیا حضرت کے دستخط

---

[1] جس کی اطاعت کی جائے۔

خاص کی لکھی ہوئی عبارت سے جو سمجھتا ہوں اوس کا جواب لکھتا ہوں اور جو کچھ مجھ سے نہیں پڑھا گیا وہ تجویز بازور[1] لکھتا ہوں اگر بفرضِ محال کبھی ملاقات ہوگی تو آپ سے دریافت کر کے پاسخ گزار ہوں گا ہاں حضرت سچ ہے میر ابن حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس میرا بھانجہ فتنہ و فساد کے زمانہ میں بلگرام میں رہا اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے آپ کی اور بھائی منشی نبی بخش صاحب کی ملاقات سے میرا دل خوش ہوا یاد رہے سخن فہمی اوس بزرگوار کا حق ہے اب آگرہ میں بے کار اور پنشن کے امیدوار ہیں۔

ع ہر چہ گفتی از تو مکرر شنودمے[2]

شدے کی رعایت سے کہ وہ بیائے مجہول ہے یعنی میشد اکثر صاحب گفتی کو بیائے مجہول پڑھتے ہیں تاکہ میگفت کے معنی پیدا ہوں اس صورت میں خطاب سے بطرف غیب کے رجوع کرتے ہیں اور گفتی بیائے معروف سے صیغۂ واحد حاضر ہے از منہ میں سے اشعار زمانۂ ماضی رکھتا ہے اور شدن شود یہ سب استقبال کے مقتضی ہیں اور معروف گفتی ماضی ہے پس اگر گفتی بیائے معروف کہیے تو اوپر کے مصرع میں بدی کہتا ہوگا بودی کا مخفف خلاصہ یہ کہ اگر وہاں بدی کہیے تو یہاں گفتی بیائے معروف بے تکلف درست اور بیائے مجہول غلط ہے اور اگر وہاں شدے کہیے تو یہاں گفتے بیائے مجہول کہیے غیبت اور خطاب کا تفرقہ مٹا دیجیے گفتے بیائے مجہول میں خطاب حاضر مقرر رہتا ہے اور تو کا لفظ جو قریب ہے وہ اس معنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نظائر[3] اس کے فارسی میں بہت ہیں رباعی کے باب کی پرسش ہرگز نہ رہے نہیں کہی زیادہ حد ادب

(عود ہندی ۷۔۸۔۹)

---

[1] جواب دہ۔ [2] جو کچھ تو کہتا میں اس کو مکرر سنتا۔ [3] جمع نظیر یعنی مثالیں

بندہ پرور!

مہربانی نامہ آیا سر پہ رکھا آنکھوں سے لگایا اور فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول[1] مناسب طبیعت کی ہے پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدری نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں جب اور کی و عنصری وخاقانی و رشید وطواط اور اور ل کے امثال و نظائر[2] کا کلام بالاستیعاب[3] دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج[4] کی طرف نہ جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے "منکہ ہاشم" اس کی جو شرح چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجیے اور نقش میرے خاطرنشاں کیجیے تو میں سلام کردوں پہلے نظر یہاں لڑنی چاہیے کہ اوج بیان انداختہ کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے۔ اگر عقل کل کو انداختہ کا مفعول اور منکہ کے کاف کو کدامیہ ٹھہراؤ گے تو بے شبہ انداختہ کے فاعل دو ٹھہریں گے ایک ناوک انداز ادب اور ایک مرغ اوصاف تو ایک فعل اور دو فاعل یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق

---

[1] اصولوں کی اصل [2] شعرائے فارسی [3] تمام تر [4] ٹیڑھاپن۔

ہے۔ اب فقیر سے اس کے معنی سنیئے "من انداختہ" کا مفعول را مقدر منکر کا کاف توصیفی ناوک انداز ادب۔ ادب آموز یعنی استاد مرغ توصیف تو فاعل مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں تیرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرادیا عقل کل تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے اور اس کا ناوک پہنچ سکتا تھا مگر مرغ اوصاف اوس مقام پر ہے کہ جہاں اوس نازک انداز کو ناوک پہنچانے کی گنجایش نہیں اوج بیان سے گرنا عاجز آنا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گر گیا اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے اظہار عجز باوجود دعوی قدرت۔ مصرع

ایثار تو بر دوختہ چشم و دہن آز

اس کے معنی تو وہی ہیں جو چھاپہ میں لکھے ہیں۔ مصرع ثانی کی شرح میں گمراہ ہوگیا۔ مصرعہ

احسان تو ہر قطرۂ دریا بشگافت

تاہم بقید حیات تیا مدیر ہیچمدال اس معنی کے معنی نہیں سمجھا سیدھی بات ہے، مگر خیال میں جب آئے گی کہ اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں، کمال ایثار وعطا میں مروارید دیا قوت و بحر و معدن، کی کم تحقیق آتی ہے لعل و دُر کا معدوم ہوجانا اور بحر و کان کا خالی ہو جانا نئی نئی طرح سے باندھا ہے چنانچہ میں نے کسی زمانے میں اسی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر وزیر الدولہ والی ٹونک کو بھیجا تھا اوس میں کے دو شعر آپ کو لکھتا ہوں۔

ناموس نگہ داشتی از جود بہ گیتی جز پردگیان حرم معدن دیم را
دقت است کہ ایں قوم بہر کوچۂ و بازار پرسند زہم نشاء رسوائی ہم را

پردگیان حرم معدن دیم لعل و گوہر وہ جو کثرت ایثار سے کوچۂ و بازار میں خاک آلودہ

پڑے ہوئے ہیں وہ باہم دگر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں دکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں ہم کو اس قدر بے حرمت اور ذلیل کیوں رکھا ہے قطرہ کا حساب کے واسطے چیرنا بے حساب ہے، مقولہ عرفی کا یہ ہے کہ جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دے اور بخشش کا ذوق باقی رہا چونکہ قطرہ میں بالقوۃ استعداد موتی ہو جانے کی ہے تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آویں تو وہ سائلوں کو دیے جاویں پہلے مصرع میں حرص کا سیر کر دینا موافق مسلمات شعر ممتنع اور اوس کا مرفوع ہیں، آنا اغراق[1] دوسرے مصرعہ میں باحتمال استعداد بالقوۃ قطرہ کو چیر ڈالنا اور پھر اس طرح کہ ہر قطرہ کو یہ اغراق سے گذر کر تبلیغ[2] و غلو ہے۔

یہاں سے خطاب حضرت صاحب عالم کی طرف مخدوم مکرم و مطاع معظم قبلۂ دیدۂ دل کہ جو میرا اور اپنے ملنے کو از قسم فرض محال نہیں مانتے ہیں خدا کرے ایسا ہی ہو جیسا وہ جانتے ہیں تقصیر معاف ہو اگر دنیا میں ظہور ہر امر بحسب مساعدت[3] اسباب ہے تو اس تمنا کا حصول مانند اعادۂ شباب ہے کوئی وجہ نہیں پاتا آپ کے یہاں تشریف لانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی میرے وہاں آنے کی اگرچہ غیر امکان سے باہر نہیں مگر وقوع میں تامل ہے اب جو بھائی منشی نبی بخش صاحب کو خط لکھوں گا تو آپ کو سلام ضرور لکھوں گا آپ نے احباب الابعاض[4] کی خیر و عافیت عموماً لکھی بالتخصیص شاہ عالم صاحب کا سلام نہ لکھا گیا وہ وہاں نہیں ہیں اور اگر کہیں ہیں تو اون کا حال مجھے لکھیے اور اگر وہاں ہیں تو میرا سلام اون کو کہیے۔

رباعی کے باب میں مختصر یہ ہے کہ اوس کا ایک وزن معین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا کہ سوائے عجم کے یہ بحر ہزج سے نکالا ہے مفعول مفاعلن فعولن ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور اس وزن پر فعلن بڑھا دیا ہے مفعول مفاعلن فعولن فعلن

---

[1] مبالغہ کی ایک قسم [2] مبالغہ [3] مدد کرنا۔ [4] بعض کی جمع۔

زحافات اس میں بعض کے نزدیک اٹھارہ ہیں اور بعض کے نزدیک چوبیس ہیں اور وہ سب جائز اور روا ہیں اور اس بحر کا نام بحر رباعی ہے۔ رباعی یہ ہے کہ سوائے اس بحر کے اور بحر میں نہیں کہی جاتی اور یہ جو مطلع اور حسن مطلع[1] کو رباعی کہتے ہیں اس راہ سے کہ مصرعہ چار ہیں کہو ورنہ رباعی نہیں ہے نظم ہے۔ قدما کو بیشتر اس کا التزام تھا کہ ہر مصرع میں قافیہ رکھتے تھے۔ خاقانی بہ رعایت صنعت ذوقافیتین[2] کہتا ہے۔ شعر

من بودم و آں نگار روحانی روئے
افگندہ در آں دو زلف چوگانی گوئے
خلقے بدر ایستادہ خاقانی جوئے
من در حرم وصال سبحانی گوئے

میں پانسات برس سے بہرہ ہوگیا ہوں۔ ایک رباعی چار قافیے کی اس مضمون خاص کی میں نے لکھی ہے بہ رعایت صنعت ذوقافیتین۔ رباعی

[3] دارم دل شاد و دیدہ بینائے
وز کری گوشم بنود پروائے
خوبست کہ نشنوم ز ہر خودرائے
گلبانگ انا ربکم الاعلائے

فقیر اس باب میں متعصب ہے اور دو وزن کی دو بیت میں قافیہ والی کو رباعی نہ کہے گا

---

[1] دوسرا مطلع [2] جس میں دو قافیہ ہوں۔

[3] میرے پاس ایک دل خوش اور دیدۂ بینا موجود ہے۔ اور مجھے کان بہرے ہونے کی پروا نہیں ہے۔ کانوں کا بہرہ ہونا اچھا ہے کہ ہر خود رائے کے دعوے خدائی کو میں نہ سنوں۔

نثر عاری نہ قافیہ نہ وزن نثر مسجع قافیہ موجود وزن مفقود مگر اس میں ترجیع کی رعایت ضرور ہے یعنی فقرہ کے الفاظ مماثل اور بلام ہمدگر ہوں اور اگر یہ بات نہ ہوگی اور صرف قافیہ ہوگا تو اوس کو مقفے کہیں گے نہ مسجع نثر مرجز وہ ہے کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو۔ جب آپ لالہ قتیل کے گڑھے ہوئے فقرے دیکھ چکے ہیں تو مجکو فقرہ تراشی کی تکلیف کیوں دیتے ہیں۔ زمانۂ گذشتہ میں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نیر تخلص ایک مختصر سا دیوان حضرت نظامی کا مجکو دکھلانے لائے تھے اس میں نثر مرجز تھی میں اوس دن نواب مصطفیٰ خان حسرتی[1] شیفتہ کو خط لکھا چاہتا تھا اوسی وضع پر خط لکھا وہ خط پنج آہنگ میں ہے مگر میں نے بہ مقتضائے شوخیٔ طبع یہ بات کی ہے کہ ایک جگہ جو فقرے مقفیٰ ہو گئے ہیں اور وہ لفظ مجکو پسند آئے ہیں میں نے اوس کو یوں ہی رہنے دیا ہے اوس کو دستور میں نہ تصور کیجئے گا اور وہ رقعہ یہ ہے ۔

ان خواجہ بے پروا من بندہ کہ غمناکم وزعفہ جگر چاکم خواہم سخنے گفتن آں روز کہ می رفتند آں نامہ فرستادند کہ دیدن آں غوشدل تا جگراز اندگفتم چہ کنم غالب چوں کار دگرگوں شدی بایدم اینک رفت تا عذر سخن خواہم چوں گرد دو غبارے بود رفتن نتوانستم آں روز بشام آمد لا بلکہ بسر تر شد سرماندہ ببالیں چوں غم زدگان خفتم ہے ہے چہ تو اند خفت کہ غمخوارش بر زخم نمک ریزد و زدیدۂ بیدارش شونابہ رواں باشد چوں از افق شرقی خورشید درخشندہ ناگاہ سرے بر زد آتش بجہاں در زد مرغ سحری بر زد رفتم بجگر کاوی و آں راز نہانی را از دل بزباں دادم در صورت تنہائی بے پردہ چو سمرا ازاں نے آمدہ ہمدم شد چندانکہ دم اندر نے از مہر دمیدم من چوں من بنوا آمد زاں نالہ کہ بر لب بود از باطن نے سر زد

[1] نواب مصطفیٰ خان اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے ۔

آں دم کہ نفس بانی زینگونہ کشاکش کرد یک کاغذ نہ نوشتہ بود ستا بدستم
در چوں نالہ نمودی داشت زاں شعلہ کہ دودے داشت بر صفحہ نشانہا ماند گفتم
مگر ایں صفحہ غمنامہ رازستی فہرست نیازشتے باید کہ فرد بپیچم وانگہ بہ نشانمندی
زمی خواجہ رواں سازم کوتاہ کنم گفتن آں نامہ کہ من گفتم حجاب درد الا برد ند
درواں کردند ہر چند در اندیشہ پیدا است کہ خوش باشد با خواجگی استغنا یا ایں ہمہ
خوش نہ بود پوزش نہ پذیرفتن امروز سحرگاہان روشن گہر آں بیر کش روح رواں
دانم بل خوشتر ازاں دانم دیوان نظامی را آورد لبوئے من زینگونہ نوا بود
در پردہ گفتارش کہ ذوق بہنجارش ایں زمزمہ سرکردم والا گہر اکبر خاں خواند
سلام از من[51] (عود ہندی صفحات 9/15)

---

[51] اے خواجہ بے پروا میں بندہ کہ ہوں غمگین اور غصہ سے رنجیدہ کچھ چاہتا ہوں کہنا جس روز تجھے تم جاتے خط لکھا تھا اک تم نے پڑھ کر ہوئے خوں میرے دل اور جگر دونوں سوچا کروں کیا غالب جب کام ہوا ابتر جانا مجھے ہے لازم تا عذر کروں تھا گرد و غبار اس دن ممکن نہ ہوا جانا بس شام ہوئی اس دن اور شام سے شب آئی تکیہ پہ میں سر رکھ کر غمگیں کی طرح سویا پر سوئے بھلا کیونکر وہ جس کا کوئی مونس زخموں پہ نمک چھڑکے اور آنکھوں سے پھر اس کی بہے اشکوں کی ندی جب مطلع شرق سے اس نیر تاباں نے سر اپنا نکالا پھر دنیا میں شفق پھیلی اور مرغ سحر چونکا کہ میں نے جگر کاوی اور راز نہانی کو دل سے بزبان لایا تنہائی کی صورت سے بے پردہ زمیق سامنے آ کے ہوئی ہمدم یہانتک کہ محبت سے میں نے بجائی پھر رونے سے مرے وہ بھی میری ہی طرح روئی وہ نغمہ میں نے نکلا کچھ اس شعلہ دوری کا صفحے پر نشان آئے میں نے کہا یہ کاغذ غم نامہ ہے رازوں کا فہرست عقیدت ہے اب اس کو کروں تہ میں پھر بھیجدوں خواجہ کو اب ×

بندہ پرور!

آپ کا تفقد نامہ محررۂ پندرہ نومبر آج پنجشنبہ کے دن اٹھارہ نومبر کو یہاں پہنچا۔ مارہرہ کا خط دلی چوتھے دن آیا۔ ہر دلی کا خط مارہرہ دیر میں کیوں پہنچتا ہے۔ تو تمھاری خوشی ایکے یہ خط بیرنگ بھیجتا ہوں مگر مجھ کو اطلاع دیجیے گا کہ کس دن پہنچا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا میں نے اوسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی جو سنا وہ بھی ضمیمۂ سرگزشت کرتا گیا۔ مگر بطریق لزوم[1] مالا یلزم اوس کا التزام کیا کہ بزبان فارسی قدیم جو دساتیر[2] کی زبان ہے اوس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اس کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے چنانچہ ایک نسخہ

× ختم کردوں باتیں جو خط کہ لکھا میں نے خدام ادب انے وہ بیجا کے دیاں بھیجا میں یہ تو سمجھتا ہوں زیبا ہے امارت میں یہ عادت استغنا بااینہمہ نازیبا بغدر نہ سنا بھی ہاں ہر صبح کو وہ نیر آنح جو جان ہے مری گویا اک نسخہ نظامی کے دیوان کا لے آیا اور رلا کے دیا مجھ کو اس طرح کی تحریر اک دیوان میں جو دیکھی اس طرز پہ میں نے بھی گایا ہے یہ اک نغمہ والا گہر اکبر خاں میں میرا اسلام شوق۔ ۱۲

[1] ایسی چیز اپنے ذمہ لازم کرنا جس کا لازم کرنا ضروری نہ ہو [2] غالب کی ایک کتاب جو خالص فارسی زبان میں ہے۔

آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں مگر یہ نذر ہے جناب قبلہ و کعبہ حضرت صاحب عالم صاحب کی اور چونکہ وہ آپ کے بزرگ ہیں جرأت نہ کر سکا کہ آپ کی نذر کر دوں اور سیرو میں اون کو مشترک رکھوں نذر ان کی ہے اور فیضیابی آپ کی مطالعہ سے ہیہات یہ کاتب اساتذہ کے کلام کو کیا بگاڑ دیتے ہیں گویا مسخ کر دیتے ہیں ان سے بعید نہیں، لیکن اوسے اور حضرت صاحب سے بعید ہے کہ سہو کاتب کا نہ سمجھ لیا۔

من آں دریائے آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

دو کانوں کا علی التواتر آنا دوسری بات ہے۔ دریائے آشوب کیا ٹکسالی یا ہر لفظ ہے استعارہ بالکنایہ صحیح مگر یہ محل نہیں ہے تو دریا چاہیے بے شائبہ استعارہ و کنایہ عیاذاً باللہ عرفی اگر ایک بڑا قدح بھنگ کا یا ایک بوتل شراب کی پیے ہوئے ہوتا تو بھی یوں نہ لکھتا اس غریب کا مصرعہ یوں ہے۔

من آں دریا پر آشوبم کہ از تاثیر خاصیت

دریا موصوف، پرآشوب صفت، دوسرے مصرعہ کا کاف صفت کی تفسیر۔

اب روئے سخن حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف امیدوار ہوں کہ میرے ہم عمر مرشد میرے ہم فن مخدوم میری تقصیر معاف کریں اگرچہ ترسٹھ برس کی عمر میں بہرا ہو گیا ہوں پر بینائی میں فتور نہیں عینک سے اعانت چاہنی منظور نہیں باوجود حدت بصر بہ سبب نقص فہم کے دستخطی عبارت مجھ سے پڑھی نہیں جاتی[1] آگے جو دو بار میں نے جواب لکھا ہے حرف قرائن ملحوظ رکھے ہیں ورنہ عبارت بالاستیفا مجھ سے نہیں پڑھی گئی آخر چودھری صاحب تو آپ کے معتقدوں میں بمنزلہ عزیزوں کے ہیں جو آپ فرمایا کریں وہ انہیں الفاظ کو لکھ دیا کریں اب سب عبارت کا جواب لکھوں گا کہ کتاب کی رسید اور اس مطلب کا اعادہ[2] تحریر بدستخط چودھری صاحب میرے پاس آجائیگا۔

[1] زیادہ حداد ب۔
[2] زیادہ حداد ب۔ عود ہندی صفحات ۱۶-۱۷

جناب چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور شکر احسان بجا لاتا ہوں اور حاشا و حاش اللہ کے جواب کو حوالہ اون سطور پر رکھتا ہوں کہ جواب جناب حضرت صاحب کے ارشاد کے جواب میں لکھوں گا۔ آپ کو اتنا لکھنا اور کافی ہو کہ اپنے عم والاقدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام نیاز پہنچائیے اور جناب شیخ عطا حسین عطا کو بھی سلام کہیے۔

اب خطاب حضرت صاحب عالم صاحب کی طرف ہے۔ پیر و مرشد قلم کا کام زبان سے لینا بھی تحریر کے مطالب کو پڑھنا اور پڑھا دینا آسان ہے اور زبان کا کام قلم سے لینا دشوار ہے یعنی جو کچھ کہا چاہیے اوس کو کیونکر لکھا چاہیے۔ وہ بات کہاں کہ کچھ میں نے عرض کیا کچھ آپ نے فرمایا دو چار باتوں میں جھگڑے نے انجام پایا۔ خیر دولت ہمزبانی کہاں میسر آپ کے حکم بجالانے کو اپنا شرف مانتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوالی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اس کی تصدیق نہ کرے تب تک اوس کا کلام قابل استناد نہ ہو۔ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں اوس کے فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خان کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے بیشتر سادہ کشمیری یا کابلی دفتر ھاری دکمرانی احیاناً کوئی عامہ اہل ایران میں سے

ہو مانا کہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہو گا تقریر اور ہے تحریر اور ہے، اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط سے اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید، یہ سب نثر میں کیوں خون جگر کھایا کرتے وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران کبھی کبھی لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے یہ شخص مدعی ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ بس آرزو کدہ اور دیو کدہ اور نشتر کدہ اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہل زبان کے کلام میں آیا ہے نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اوس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں اوس پر حضرت غور فرمائیں تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔ آمدم بر سر مدّعا۔ نثر مرجز اوس کو کہتے ہیں کہ وزن اور قافیہ نہ ہو مقابل مقفیٰ کے قافیہ ہو اور وزن نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھا چاہیے کہ وزن میں قید منظور نہیں۔ مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمہ کی نثر کا وزن یہ ہے۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔ حضرت ظہوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

رہ تیش سرو بن گلشن فتح خنجر ش ماہے دریائے ظفر

یہ نثر مرجز ہے وزن اس کا فعلاتن فعلاتن فعلن۔ کاتبوں نے مقفیٰ کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرف کیا ہے۔ نثر مرجز رہی نہ مقفیٰ چنانچہ اساتذۂ فن

لن تنالو البرّ حتیٰ تنفقو! [2]

اس آیت سراسر ہدایت اثر کو نثر مرجز کہتے ہیں اور اس کا وزن یہ ہے فاعلاتن

---

[1] ؎۱

[2] قرآن کریم کا چوتھا پارہ

فاعلاتن فاعلن ۔

ودیر زقہ من حیث لا یحتسب[1]

اس کا وزن فعولن فعولن فعولن فعول ۔ بندہ کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مقفیٰ قافیہ ہے اور وزن ہیں۔ مرجز وزن ہے اور قافیہ نہیں۔ عاری نہ وزن ہے نہ قافیہ۔ مسجع ہو مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہمدگر ہوں۔ نظم میں یہ صفت آپڑے تو اوس کو مرصع کہتے ہیں اور نثر اس صفت پر مشتمل ہو تو اوس کو مسجع کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کو نہ عبدالرزاق بدل سکتا ہے نہ صاحب قلزم ہفتگانہ نہ یہ قطرہ ہیچ بے سروپا حاشا وحاش اللہ کلام اہل عرب میں اسی طرح ہے جس طرح آپ فرماتے ہیں مگر پارسیوں نے از راہ تعریف کے بمعنی زنہار قرار دیا ہے یعنی تاکید اگر منفی پر آئے تو نفی کی تاکید اور مثبت پر آئے تو اثبات کی تاکید میں کسی کلمہ کا استعمال نہیں کرتا جب تک اہل زبان کے کلام میں نہیں دیکھا۔ عیشی بیچارہ اس کے لائق نہیں کہ مستند علیہ پڑے مگر یہ لفظ غلط نہیں لکھا ہے اس غریب نے۔ حضرت قبلہ، فارسیوں کے تصرفات اگر دیکھیے تو حیران رہ جایئے مجھ کو اس وقت کہاں یاد ہے اور کتاب کے نام تو کوئی ورق بھی لکھا ہوا میرے پاس نہیں حاشا کا کوئی شعر ہو کہ نفی اگر یاد آجائے گا تو آپ کو لکھا جائیگا ۔

ہرزہ مشتاب وپے جادہ شناساں بردار[2]

ایکہ در راہ سخن چو تو ہزار آمد و رفت

یہ مثنوی جس میں یہ مصرع ہے ع حاش اللہ کہ بدمی گویم ۔ کلکتے میں میں نے لکھی ہے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کیے تھے اس میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ ہمہ عالم غلط ہے یعنی ہمہ کا لفظ عالم کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا ۔ قتیل کا

---

[1] قرآن مجید کی ایک آیت [2] فضول نہ دوڑ اور راستہ جاننے والوں کا پیچھا کر۔ اے کہ تیری طرح سخن کی راہ میں ہزار آئے اور چلے گئے۔

حکم یوں ہے عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے ۔ مصرعہ بہمہ عالم گواہ عصمت اوست سعدی کہتا ہے ع عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از دوست ۔ غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے اب ایک نسخہ ہے البطال ضرورت اگرچہ صاحب اس کا ہندی ہے بلکہ ہندو ہے، مگر قابل اچھا ہے ۔ دیکھئے اساتذہ کیا کیا تصرفات نمایاں کر گئے ہیں ۔ میں نے آج تک اردو میں انتظاری بمعنے انتظار نہ آپ لکھا نہ اپنے شاگردوں کو لکھنے دیا اساتذہ مسلم الثبوت کے ہاں فارسی میں موجود ہے حاشا ایسا نہیں کہ ان میں فارسی داں کو تامل ہو ۔ زیادہ حد ادب

عودِ ہندی صفحات $\frac{18}{21}$

جناب چودھری صاحب آپ کو بعد ابلاغ[1] سلام آپ کے خط پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں میں نہیں آسکا یہاں پنشن کا مقدمہ پیش ہے۔ کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے خود نہ جاؤں تو یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بلا بھیجیں یا کس وقت کوئی پرسش آجائے بائیس مہینے سے وہ رزق کہ جو مقوم[2] جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے کیا کھاؤں اور کیونکر جیوں للہ الحمد کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولٹیکل سررشتہ سے مقرر کی ہوئی ہے۔ سو دلی کا اجنبٹی دفتر فرد فرد لٹ گیا کوئی کاغذ باقی نہیں رہا اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا اوس دفتر میں میری ریاست کا میری معاش کا میری عزت کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایسے ایسے پیچ پڑ گئے ہیں کچھ باقی رہے ہیں یہ بھی نکل جائینگے۔ مصرعہ

کارہا آساں شود اما بہ صبر[3]

یہاں سے روئے سخن صاحب عالم صاحب کی طرف ہے جناب رفعت مآب مولائی

---

[1] بھیجنا ۔ پہنچانا ۔ [2] قوام کنندہ ۔

[3] کام آسان ہوتے ہیں مگر صبر کرنے سے ۔

و مرشدی تسلیم قبول کریں اور اس تحریر سے جواب میرے پاس بھیجی ہے مجھ کو شاداں اور اپنے بخت اور قسمت پر نازاں تصور فرمائیں سب سمجھا اور سب مطالب کا جواب لکھتا ہوں پہلے اپنا ایک شعر کمال گستاخی کو کارفرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے۔

مرا بغیر ز یک جنس در شمار آورد[1]
فغاں کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش

بہر حال حضرت کو یہ معلوم ہے کہ میں اہل زبان کا پیرو ہوں اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب اور کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اوس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔ جن لوگوں کے محقق ہونے پر اتفاق ہے جمہور کو ان کا حال کیا گذارش کروں ایک اون میں صاحب برہان قاطع ہے۔ اب میں ان دنوں قاطع برہان دیکھ رہا ہوں اور اوس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخہ کا نام قاطع برہان رکھوں گا۔

مصرع کجا بود منزل کجا تاختم[2]

شعر فردوسی میں انگبین و شہد اور شعر استاد میں حرص و آز زوائد بادی النظر میں زائد معلوم ہوتے ہیں۔ شیر ناب بہتر ہے لیکن حرص و آز کو کیا کیجیے گا میں عرض کرتا ہوں کہ وہاں بھی خشم و آز ہے ہرگز حرص و آز نہیں ہے حکما اور صوفیہ قوت غضبی[3] اور قوت شہوی[4] کی تعدیل[5] کرتے ہیں۔ قوت غضبی کی اصلاح سے فضیلت شجاعت

---

[1] مجھے اور غیر کو اس نے ایک طرح کا سمجھا۔ افسوس کہ وہ مکھی اور پروانے کی پہچان بھی نہیں رکھتا۔
[2] کہاں میری منزل تھی کہاں میں چلا گیا۔ [3] غصے کی قوت
[4] خواہشات نفسانی [5] معتدل کرنا۔

اور قوت شہوی کی اصلاح سے فضیلت عفت حاصل ہے اور یہ مسئلہ علم الاخلاق میں مبرہن ہے[1]۔ دو دیدہ من حرص و آز۔ بے معنی محض استاد کو بدنام کیا ایک اسم سے دو مسمیٰ تراشے۔ واحد حقیقی کا تثنیہ اس سے علاوہ۔ مرد عارف حکیم نے قوت شہوی کی اصلاح کا ذکر کیا اور خوف عقبیٰ کا مذکور بھی نہ کیا۔ میں نے خود چشم و آز دیکھا ہے اور یہی بجا ہے۔ شہد کی جگہ شیر اور حرص کی جگہ خشم درست ہے۔ میری رائے آپ کی رائے کے مطابق مگر گو گرد سرخ اور پیل سفید میں ساکت ہوں یہ تقریر کہ گو گرد سرخ کمیاب اور پیل سفید نایاب ہے میرے دلنشیں نہ ہوئی۔ کبریت احمر اور کیمیا اور عنقا ان سب کا ایک حکم ہے۔ نظر اس قاعدہ پر لعل سفید بہتر ہے اور کبریت احمر اور پیل سفید بے جوڑ ہے جیسے امیر خسرو کی املیاں ایک قاعدہ اور عرض کرتا ہوں۔ کم کا لفظ اہل فارسی کی منطق میں کہیں افادہ معنی سلب[2] کلی بھی کرتا ہے جیسے کم آزار یعنی نیازار ندہ نہ یہ کہ کم آزار ندہ۔ کم ہمتا یعنی بے ہمتا بلکہ اندک کا لفظ بھی اسی طرح آتا ہے' جیسا کہ میرا خدا وند نعمت نظامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتا ہے شعر

پس و پیش چوں آفتابم یکے ست
فرد غم فراواں فریب اندکے ست

یعنی فریب بالکل نہیں نہ یہ کہ کچھ ہے پس کمیاب اور نایاب ایک چیز ہے نظامی نے لعل سپید کہا ہے کسی صاحب طبع نے اس کو غلط سمجھ کر پیل سفید بنا دیا ہے' انگبین و شہد ناب شاید مثل غم و اندوہ مسرت و فرحت ہو یا نہ ہو شیر ناب ہی ہو بلکہ شیر ناب بہتر ہے لیکن حرص و آز تو کسی طرح درست نہیں عارف کا دعویٰ ناقص اور نغو رہا جاتا ہے اگر یہ قباحت لازم نہ آتی تو بھی ہم حرص و آز کو مسلم نہ رکھتے کس

---

[1] صاف۔ ظاہر
[2] نفی قطعی

واسطے کہ غلام کا شبہ بکمال وضوح غم واندوہ و عدل و داد کا نظیر نہیں ہو سکتا ہاں انگبین و شہد کے جواز میں ہم مضائقہ نہ کرینگے مگر شیر ناب کو اس سے اچھا سمجھیں گے شہد میوہ کی حلاوت کے واسطے اور شیر افزایش لطافت کے واسطے حاشا و حاش اللہ کا جواب آغاز تحریر میں لکھ چکا ہوں آپ کی اس نظیر لکھنے سے اس کے جواز پر میرا یقین نہ بڑھا۔ لو کشف الغطا ، ما ازددت۔ یقیناً[1] نثر مرجز کے باب میں پیر و مرشد کو اتنا تامل کیوں ہے یہ جو نثریں آپ نے لکھی ہیں، سوائے اس نثر کے کہ جس کو آگے لکھوں گا یہ تو سب مسجع ہیں یعنی پہلے فقرہ کا ہر لفظ وزن میں موافق ہو دوسرے فقرہ کے لفظ سے۔ نظم میں یہ صفت آپڑے، تو نظم کو مرصع کہیں گے اور نثر میں واقع ہو تو نثر کو مسجع کہیں گے۔ جو حضرت کہ اس نثر کو مرجز کہتے ہیں وہ نثر مسجع کی مثال ہم کو دیں زنہار زنہار یہ نثر مرجز نہیں مسجع ہے۔ ہاں یہ نثر مرجز ہے صاحبا، مشفقا شفیق ولی زید الطافکم الی الابد بعد تبلیغ بندگی نیاز ہر ضمیر منیر روشن باد۔ اگر وہ نثر کہ جس کو میں نے مسجع کہا ہے مرجز ہے تو اس کم بخت نثر کا کیا نام ہے۔ وہ مسجع ہے اور یہ مرجز ہے۔ میں تو بہت مختصر مفید لکھ چکا ہوں آپ نہ مانیں تو کیا کروں۔ وزن نہ ہو قافیہ ہو وہ مقفیٰ، وزن ہو قافیہ نہ ہو وہ مرجز ہے۔ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں وہ مسجع۔ اس صنعت کو بیشتر نثر مقفیٰ میں صرف کہتے ہیں، اور چاہو قافیہ کا التزام نہ کرو، بہر رنگ اقسام ثلثہ نثر یہی ہے۔ حضرت نے نثر مسجع کو مرجز کہا ہے جواب وہی ہے کہ اگر مرجز یہ ہے تو مسجع کس نثر کو کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام۔ قتیل لکھنوی غیاث[2] الدین ملائے مکتبی رامپوری کی قسمت

---

[1] اگر حجابات اٹھا دیے جائیں تو میرے یقین میں اضافہ نہ کریں گے۔

[2] مؤلف غیاث اللغات و شرح گلستاں و شرح سکندر نامہ وغیرہ

کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو معتمد سمجھے بعد اتمام خط کی تحریر کے خیال آیا کہ شاید کسی بات کا جواب رہ نہ گیا ہو میں نے آپ کے خط کو دیکھا اور ایک بات دستور شگرف کی عبارت میں نظر آئی۔ مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد سجع ندارد اس تعریف کو دیکھیے اور نمونۂ نثر کو دیکھیے وہ موزوں کہاں ہے جو وزن دارد اُس پر صادق آئے وزن بمعنی تقطیع شعر مفقود سجع ندارد۔ خدا جانے یہ بزرگ سجع کس کو کہتا ہے۔ سجع ہموزن ہونا دو لفظوں کا فقرتین میں یا مصرعین میں سو اس نثر میں موجود ہے۔ موجود کو مفقود کو موجود لکھا ہے اور پھر کلام اس کا مقبول ہے، اللہ اللہ ملا غیاث الدین لکھتا ہے پس مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جا ہا ہموزن باشد در تقابل یک دگر بدون رعایت سجع۔ خدا کے واسطے سجع تو اسی کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین یا مصرعین ہموزن یکدگر ہوں سو اس نثر میں موجود ہے۔ کہ بدوں رعایت سجع کے کیا معنی۔ مگر یہ دونوں صاحب وزن کو برابر ہونا کلمات کا سمجھتے ہیں اور سجع تقطیع شعر کو کہتے ہیں۔ اس عقدہ کی رکاکت اظہر من الشمس ہے۔ صاحب دستور شگرف کا کلام نقش اور مولوی غیاث الدین کا کلام حدیث نہیں ہے آپ بھی غور فرمایئے اور انصاف کیجیے۔

عود ہندی صفحات $\frac{21}{26}$

"صاحب عالم کے نام"

میکنم عرض گو مکرر باشد (میں دوبارہ کہتا ہوں چاہے وہ مکرر ہی کیوں نہ ہو) پیر و مرشد۔ آج ہی ایک خط چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا روانہ کیا ہے اور اس خیال سے کہ وہ گرمی ہنگامہ شادی میں اس خط کو آپ کی نظر سے گذرانا بھول نہ جائیں یہ خط جداگانہ آپ کو آج ہی بھیجتا ہوں۔ اصحاب ثلثہ کی عبارت نثر مرجز کے باب میں آتی ہے وزن دارد سجع ندارد۔ خدا کے واسطے وزن تقطیع شعر کو کہتے ہیں وہ تمثال کی نثر میں کہاں ہے؟ سجع اس کو کہتے ہیں کہ کلمات فقرتین وزن میں برابر ہوں یہ صفت مثال کی نثر میں موجود ہے، جو ہے اس کا سلب جو نہیں اس کا ثبوت کیونکر مانوں کیا آپ کی یہ مرضی ہے کہ الفاظ کے ہموزن ہونے کو تقطیع شعر کو سجع مان لوں۔ میں تو نہ مانوں گا آپ کو اختیار ہے۔ یہ کلام معصوم کا نہیں کہ اس کے مسلم نہ رکھنے سے آدمی کافر ہو جائے زبان فارسی مردے کا مال ہے عرب کے ہاتھ بطریق یغما آیا ہے جس طرح چاہیں صرف کریں۔ خواجہ نصیرالدین طوسی آٹھ حرف کا زبان فارسی میں نہ آنا لکھتے ہیں اور ذاتی نقطہ دار کا ذکر نہیں کرتے۔ للہ کوئی لغت فارسی ایسا بتایئے کہ جس میں ڈال آئی ہو گزاشتن و گزشتن و پذیرفتن سب زے سے ہے کاغذ دال

لہ نوٹ

مہملہ سے ہو اس کا ذال سے لکھنا اور کاغذ کو اس کی جمع قرار دینا تقریب ہے۔ بہ تحقیق اور اسم آتش بدال ابجد ہے نہ بذال ثخذ۔ کوئی لفظ متحد المخرج فارسی میں نہیں بلکہ قریب المخرج بھی نہیں۔ تے ہے طوے نہیں سین ہے ثے نہیں اور صاد نہیں۔ ہائے ہوز ہے حائے حطی نہیں۔ یہاں تک کہ قاف نہیں۔ اس راہ سے کہ غین متحد المخرج بلکہ قریب المخرج ہے۔ زے کے ہوتے ذال کیونکر۔ وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط۔ ارے تیرا ستیاناس جائے، بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ نامراد وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو بر نہ آوے۔ بے مراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو۔ از قسم بے مدعا و بے غرض و بے مطلب حسبتہ للہ[1]۔ ان دونوں امر میں کتنا فرق ہے۔ نارو اور ناکام اور نادرست اور ناچار کہ یہ مخفف ناچارہ اور ناہار کہ یہ مخفف نہ آرہا ہے اور نامراد اور ان انصاف یہ سب درست ہیں۔ ہائے کہاں گئے ہانسی والے معلم۔ قافیہ شائگاں کہ جس کو عرب الیطا کہتا ہے وہ سب دو طرح پر ہے خفی و جلی۔ اہل خرد نے خاک اڑائی ہے اور بات بنائی ہے۔ خفی اور جلی کی تفسیر میں وہ کچھ لکھتا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اس کو نہ سمجھے چہ جائے آنکہ مانے اصل یہ ہے کہ ایطا وہ قافیہ ہے کہ جو دو حرف ایک صورت کے ہوں جیسے الف فاعل گویا و بینا و شنوا۔ شعر اسیر۔

اے دانۂ تسبیح، خیالت دل دانا
ہر حلقۂ مستاں رخت دیدۂ بینا

اور نون دال مضارع کا جیسا استاد کے اس مطلع میں ہے ؎

---

[1] خدا کے واسطے۔

دل شیشہ و چشمان تو ہر گوشہ بر ندش
مست است مبادا کہ بناگہ شکندش

اور ایسا ہی ہے الف نون جمع کا مثل چراغان و جوانان اور ایسا ہی ہے الف نون حاشیہ مانند گریاں و خنداں۔ پس اگر یہ مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ آپڑے تو ایطائے خفی ہے۔ ائمہ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر قائل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں۔ خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خر ان ناشخص[1] کیا کہتے ہیں اور میں خستہ دردمند کیا بکتا ہوں واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو قوت ممیزہ[2] سے کام لو ان غولوں[3] پر لعنت کرو، سیدھی راہ پر آجاؤ۔ اگر نہیں آتے تو تم جانو تمھاری بزرگی پر اور میرز تفتہ کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے۔ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچہ اور اس معلم سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔ عربی کا حرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور ہے سمجھو یا نہ سمجھو تم کو اختیار ہے عقل کو کام فرماؤ غور کرو عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما

---

1. بے وقوف
2. تیز کرنے والی قوت
3. اگیا بیتال

نہ تھا واقف غوث الاعظم نہ تھا میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں۔ مانتے ہو مانو، نہ مانو تم جانو۔

عود ہندی صفحات ۲۷/۲۹

نوٹ: یہ واحد مکتوب عود ہندی میں جس ترتیب سے درج ہے راقم نے بھی اسی ترتیب سے درج کر دیا ہے، کیونکہ یہ خط پچھلے دو خطوں کے تسلسل میں ہے۔ جن میں تخاطب سرور سے ہے مگر متن میں صاحب عالم صاحب سے کلام کیا گیا ہے۔

میرے شفیق دل چودھری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ دیکھو میرے حواس کا اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ تمھارے نام کی جگہ چچا کا نام لکھا تھا اسی طرح سابق کے خط میں سرنامہ پر لکھ گیا ہوں گا۔ بیت

ا؎ بہار پیشہ جوانی کہ غالبش نامند
کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نفسش

جو خط کہ آپ کے خط کے جواب میں آئے ہیں اون کو بھیجنے کی کیا حاجت تھی۔ آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دلنشین اور خاطر نشان ہے جیسا کہ کوئی استاد کہتا ہے۔ بیت۔

۲؎ تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اردو اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا اپنے خدا سے اُمیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اوس کے نکل جائیگا۔ بندہ پرور میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کیا فارسی

ا؎ وہ شگفتہ مزاج جوان جسے غالب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ذرا اب دیکھو کہ اس کی ہر سانس قدر خون ٹپکتا ہے۔

۲؎۔ جنھیں تقدیر ہی نے خالی رکھا ہے ان کو رہبر کامل کے مل جانے سے کیا فائدہ۔ کیونکہ خضر ایسا رہنما بھی سکندر کو چشمۂ آب حیات سے پیاسا لاتا ہے۔

کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا
کہ وہ مسوّدات مجھ سے لیکر جمع کر لیا کرتے تھے سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر
لٹ گئے، جس میں ہزاروں روپے کے کتبخانہ بھی گئے، اس میں وہ مجموعہاے
پریشاں بھی غارت ہوئے ہیں خود اس مثنوی کے واسطے خونِ درجگر ہوں ہائے
کیا چیز تھی۔ پارسل میں خطوط بھیجنے محل اندیشہ ہے خدا نے بچایا۔ چونکہ اب وہ
خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا ازراہِ کرم احتیاطاً پارسل میں سے نکال لیے۔

عودِ ہندی صفحات ۳۶/۳۷

جناب عالی

چہا چہا ترجمہ ہندی ایک بار چہا کفایت کرتا ہے۔ انواع انواع ہماری آپ کی بول چال میں ہے لیکن تحریر میں درست نہیں چمن پر فضا۔ چمن پر فزا۔ انزائے ہوز سے کیوں لکھا؟ خطاب واحد غائب فقط شین ہے۔ نازش۔ ہاں اگر آخر نقطہ مبتی بائے انتہائی حرکت پر ہو مثل غمزہ و چشمہ و شمارہ و دانہ تو اوس کو یوں لکھتے ہیں۔ چشمہ اشش۔ غمزہ اش۔ خانہ اش۔ دانہ اش۔ اور باقی اور سب الفاظ کا حرف آخر شین سے مل جاتا ہے۔ خطاب واحد حاضر۔ خطاب واحد غائب خطاب متکلم۔ ت، م ہے۔ الف کو یہاں کیا دخل۔ اور وہ جو دکھنی بوہرہ یعنی جامع۔ برہان قاطع۔ ات ،ام لکھتا ہے ۔غلط کرتا ہے۔ جہاں تم نے بعد اپنے نام کے یہ اشعار لکھے ہیں ؎

پریشاں تر ز خویشم داستاں است الخ

یہاں ربط کلام جاتا رہا تھا ایک جملہ فاصل کر دیا ہے یعنی ۔ بدیں اشعار زمزمہ سرا است ۔ یہ خبر اوس کاف توصیفی کی ہے اور آگے جو نثر ہے اوس کا فاعل وہی مصنف ہے۔

حضرت پیر و مرشد صاحب عالم صاحب کی خدمت عالی میں میرا اسلام مسنون عرض کیجیے گا اور یہ عرض کیجیے گا کہ آپ کے منشور عطوفت[1] کا جواب بانفراد

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آپ کی خدمت میں پہنچے گا۔

عود ہندی صفحہ ۳۹

مطبوعہ:
(راجہ رام کمار پریس بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۱ء)

(گزشتہ سے پیوستہ)

۱؎ وہ فرمانِ شاہی جو لطف و کرم پر مبنی ہو۔

میرے مشفق کو میرا سلام پہنچے ۔ دونوں مخمس بعد اصلاح کے پہنچتے ہیں۔ منشاء اصلاح سمجھ لیجیے ۔ سید عالی نسب ہادی سرورِ والا حسب یہ افتتاح کلام اور ابتدائے خطاب کے درخور نہ تھا۔ مصرعۂ ثالث اوس کی جگہ رکھ دیا ہے دوسرے بند کی دو طرح پر تخمیس ہے دونوں بے عیب ہیں۔ اور مزید لطف کسی میں نہیں۔ جن مصرعوں کو چاہو رہنے دو۔ گذشت از افلاک واز افلاک گذشت۔ ایک فارسی رہا اور دوسرا ہندی ۔ حضرت نے دونوں فارسی میں لکھے تھے۔ ندامت فعل پر مرتب ہوا کرتی ہے ۔ ترجمہ اس کا پشیمانی ۔ حضرت یوسف کو ندامت کیوں ہو ؟ مگر خجالت اوس کا ترجمہ شرمندگی ۔ اب غور کیجیے کہ ندامت اور خجالت میں کتنا فرق ہے ۔ جہاں آپ نے عرق ریز ندامت لکھا وہ محل خجالت کا تھا ۔ آپ نے ندامت کیوں لکھا ۔ بہر حال وہ مصرعہ تو بدل گیا لیکن اطلاع ضرور تھی ۔ طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہے اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایش دنیا بھی مجاز ہے ۔ مرادف طرز روش بھی طرح ہے ۔ بفتحین اس کا تفرقہ منظور رہا کرے ۔ نسیم تخلص اچھا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ نسیم مونث ہے ۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جرأت اور وحشت اور ایسے بہت سے تخلص ہیں کہ وہ مونث ہیں ۔ بایں ہمہ اگر بدلا چاہیئے تو اس کا ہموزن سلام و سلیم اور خیال بھی ہے ۔ اس میں سے جو پسند آئے ۔ آپ کے عم عالی مقدار اور آپ کے بزرگ آموزگار کو میرا سلام پہنچے ۔

یہاں سے روئے سخن حضرت پیر و مرشد صاحب عالم کی طرف ہے۔ پیر و مرشد کی خدمت میں سلام اور مرشد زادوں کی جناب میں دعائے طول عمر و دوام دولت پہنچا کر یہ عرض کرتا ہوں کہ واقعی حضرت شاہ عالم کا عنایت نامہ آیا تھا اور میں اوس کا جواب بھیج چکا ہوں۔ عجب ہے حضرت کی تحریر میں جہاں اون کے خط کا ذکر تھا وہاں میرے خط کا ذکر نہ تھا اور ان سطور کی تحریر کے بعد اپنے خط کا پہونچنا گمان نہیں کر سکتا ہوں میں اوس میں اون کو یہاں کا حال لکھ چکا ہوں۔ پنج آہنگ آپ نے لی۔ دیوان فارسی آپ کے پاس ہے۔ مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب کہیں سے اون کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ دستنبو میں نے نذر کی تھی مہر نیم روز معلوم نہیں آپ کے پاس ہے یا نہیں خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ جو دستنبو میں ہے ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لے لیجئے۔

بآدم زن بشیطاں طوق لعنت
سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل[1]

رباعی

دنیا ہیچ ست و شادی و غم ہیچ ست   ہنگامۂ شور و بزم ماتم ہیچ ست
رو دل بیکے دہ کہ دو عالم ہیچ ست   ایں نیز قرزد کہ ہم ہیچ ست

[1] آدم کو زن ازراہِ تکریم دی گئی اور شیطان کو ازراہ تذلیل طوق لعنت دیا گیا: مگر حالت قید میں آدم کا طوق شیطان کے طوق لعنت سے زیادہ وزنی رہا۔

اس درماندگی کے دنوں میں چھاپہ کی برہان قاطع میرے پاس تھی اوس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط۔ ہزارہا بیان لغو عبارت پوچ اشارات پادر ہوا میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اوس کا نام رکھا ہے چھپوانے کا مقدور نہ تھا مسودہ کاتب سے صاف کروالیا ہے اگر کہو تو بسبیل مستعار بھیجدوں اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں وہ اوس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔

میرے کرم فرما میرے شفیق!

لہ شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب
اے تو غائب ز نظر مہر تو ایمان من ست

آپ کے اس خط کا جواب بعد لکھنے اس شعر کے منحصر اس التماس پر ہے کہ میری طرف سے جواب خط میں کبھی تقصیر نہ ہو گی۔ لیکن اغلب اور اکثر ابتدا بہ تحریر نہ ہو گی یہ خط ناچار از روے اضطرار واپس بھیجتا ہوں واسطے خدا کے میرے پیر و مرشد کے ارشادات کو ایک کاغذ پر اپنے ہاتھ سے نقل کر کے جلد بھیجیے، تاکہ بد نصیب کو معلوم ہو کہ حضرت نے کیا لکھا ہے۔ جناب چودھری صاحب غلام رسول کی خدمت میں سلام و نیاز اور شاد شیخ عطا حسین کی جناب میں سلام،

(عود ہندی صفحہ ۴۴)

لہ اسلام کی شرط میں ایمان بالغیب قبول کرنا ہے۔ اے وہ شخص تو میری نظر سے غائب ہے تیری محبت میرا ایمان ہے۔

میرے شفیق دلی کو میرا سلام پہنچے

کل انشا کا پارسل پہنچا اور آج خط۔ انشا کا نام بہارستان اور اب آپ کا تخلص سرور۔ بہارستان مضاف اور سرور مضاف الیہ۔ "بہارستان سرور" اچھا نام ہے۔ قطعہ کا وعدہ نہیں کرتا کس واسطے کہ اگر بے وعدہ پہنچ جائے گا تو لطف زیادہ دے گا۔ اور اگر نہ پہنچے گا تو محل شکایت نہ ہوگا رفع فتنہ، وفساد اور بلاد میں مسلم یہاں کوئی طرح کی آسایش نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً برے ٹھہر گئے یہ داغ ان کی جبین حال سے مٹ نہیں سکتا اموات* میں مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روشن ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری میری زبان سے کہتا ہے۔

شعر [1] اے دریغا نیست ممدوح سزاوار مدیح

اے دریغا نیست معشوقِ سزاوارِ غزل

گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے۔ اشرفیاں نہیں اور خلعت ریاست دودمانی [2] کا سات پارچہ جات اور تین رقم جیغہ سرپیچ مالائے مروارید

---

[1] افسوس کہ کوئی ممدوح مدح کے قابل نہیں۔ اور کوئی معشوق سزاوار غزل باقی نہیں

[2] خاندانی [3] ایک مرصع زیور جو دستار میں پہنتے ہیں۔

* یہ الفاظ عود ہندی صفحہ ۴۴ پر اسی طرح تحریر ہیں (اموات یعنی مردہ لوگوں میں)

مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل یہاں آتے ہیں دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں۔ پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں صناعت شعر[1] اعضاء و جوارح کا کام دل چاہیئے دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ کھنڈ کیوں کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر ولولہ شباب کہاں رعایت فن اس کے اسباب کہاں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پیر و مرشد کو سلام و نیاز پہنچے۔ کشف الخضیب صور جنوبی میں سے ایک صورت ہے اس کے طلوع کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔ اختر شناسان ہند کو اس کا کچھ حال معلوم نہیں اور ان کی زبان میں اس کا نام بھی یقین ہے کہ نہ ہوگا۔ قبول دعا وقت طلوع منجملہ مضامین شعری ہے جیسے کتابوں کا بیر تو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہونا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کر منگوایا اور قطعات زمرد اس کے محاذی[2] چشم رکھے کچھ اثر ظاہر نہ ہوا ایران و روم و فرنگ سے انواع کپڑے منگائے چاندنی میں پھیلائے مسکا بھی نہیں[3]۔

---

[1] شعر کہنا۔ [2] مقابل۔ [3] اسی سلسلے میں غالب سرور کو لکھتے ہیں:

بزم میں میزبان قیصر و جم   رزم میں اوستاد رستم و سام

قیصر روم کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔ جم ایران کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو بڑا مہمان نواز تھا۔ شاہ ظفر کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں اس محفل میں قیصر و جم جیسے جلیل القدر بادشاہ اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ اور میدان میں فن سپہ گری میں ایران کے مشہور پہلوانوں رستم و سام کو طریقہ جنگ کی تربیت دیتا ہے رستم و سام دنیا کے بڑے پہلوانوں میں سے تھے۔ سام رستم پہلوان کے دادا کا نام تھا۔ اشعار

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم   جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

چشم بد دور خسروانہ شکوہ   لوحش اللہ عارفانہ کلام

تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوتی ہے کبھی ۲۱ مارچ، کبھی ۲۳ آ پڑتی ہے۔ اس لیے تجاوز نہیں رہا جامع وقت

(گزشتہ سے پیوستہ)

وارث ملک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے گیو و گودرز و بیژن و رہام

ایرج، تور، خسرو، بہرام ایران کے کیانی بادشاہ تھے۔ گیو، رستم کا داماد تھا۔ بیژن کی داستان شاہنامہ فردوسی میں رقم ہے۔ گیو۔ گودرز، بیژن۔ رہام۔ یہ سب ایران کے مشہور و معروف پہلوان تھے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یہ سب پہلوان تیرے زور بازو کو تسلیم کرتے ہیں۔

شعر: ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا

طغرل اور سنجر دھوکہ دے کر ملک کے وارث بن بیٹھے تھے۔ جب بادشاہت شاہ ظفر کے قبضہ میں آئی تو معلوم ہوا طغرل و سنجر جو فریب دے کر بادشاہ بن گئے تھے وہ غلط تھے۔ ملک کے صحیح وارث بہادر شاہ ظفر ہی تھے۔

شعر: درمعنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

لقا مصر کے شاہان فراعنہ میں ایک کا نام تھا جو اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرو کر رکھتا تھا۔ مراد اس شعر سے یہ ہے کہ شعر گوئی کی قابلیت کے لحاظ سے میری تحریر لقا کی ڈاڑھی کی موتیوں کی لڑی ہے۔ مگر وائے ناکامی کہ دنیا بھر کے تمام غم واندوہ میرے سینے میں اس طرح ابھرے ہوئے ہیں جیسے عمر عیار کا کچکول جو دنیا بھر کی چیزوں کو اپنے میں سمو لیتا تھا۔

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

اس وقت تک حضرت خضر کا سکندر سے تیرا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے جب تک آبِ حیات سے زبان پاک نہ کر لیں

تحویل درست کرنا بے کتب فن اور مبلغ علم ممکن نہیں۔ میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں رہیں۔

ـلہ ندانم کہ گیتی چساں می رود
چہ نیک و چہ بد در جہاں می رود

میں تو اب روز و شب اس فکر میں رہتا ہوں کہ زندگی تو یوں ہی گزری اب دیکھیے موت کیسی ہو۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسب حال ہے۔ سکّہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب، کس سے کہوں۔ کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے۔ انھوں نے دلّی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہیں۔ ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور دربار کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے اس کا گلہ کیا۔ شعر

ـلہ مجھے نہیں معلوم کہ زمین کس طرح چل رہی ہے اور دنیا میں اچھا برا کیا ہو رہا ہے۔

لہ چوں جنبش سپہر بفرمان داور ست
بیداد نہ بود انچہ بما آسماں دہد

یہ تحریر بطریق حکایت ہے نہ بسبیل شکایت

لہ گویند از ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ پرسش رفت کہ چہ حال داری۔ فرمود کدام حال خواہد بود۔ کسے را کہ ازوے فرض طلبد و پیمبر سنت زن نان خواہد و ملک الموت جان۔

قصہ مختصر اب زیست بامید مرگ ہے۔ قاطع برہان چودھری صاحب کی نثر کے اجزا کے ساتھ بھیجا جائے گا بمقابلہ برہان قاطع منطبعہ دیکھا جائے اور بے حیف و بے میل از راہ انصاف دیکھا جائے۔ مرشد زادوں کو سلام مسنون اور دعائے افزونی عمر و دولت پہنچے۔

(عود ہندی صفحات ۴۴/۴۷)

لہ جب آسمان کی گردش حکم الہی سے ہے تو آسمان سے جو مکروہات ہم کو پہنچتے ہیں وہ قابل شکایت نہیں انہیں ظلم نہ سمجھنا چاہیے۔

لہ کہتے ہیں کہ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ آپ کا کیا حال ہے فرمایا اس شخص کا حال کیا ہوگا جس سے خدا فرض اور پیغمبر سنت، بیوی نان و نفقہ اور فرشتۂ موت جان مانگتا ہے۔

حضرت چودھری صاحب!

عنایت نامہ سابق۔ بیت تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب۔ کوئی اس کا جواب کیا لکھتا۔ آج دوپہر کو یہ خط پہنچا آج ہی آخر روز جواب لکھ کر چھوڑتا ہوں کل صبح کو بشرطِ حیات ڈاک میں بھجوا دوں گا۔ قاطع برہان کے مجلدات جو بموجب توقیع خریداری میری ملک ہیں وہ اول جولائی میں میرے پاس اور ان میں سے دو مجلد آخر جولائی میں آپ کے پاس پہنچیں گے ایک آپ رہنے دیں گے اور ایک پیر و مرشد کی نذر کریں گے۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔ شعر۔

جدا از فیض تعلق معجز کلکش نگر
گر رود صد سالہ رہ پیشِ نظر باشد ہماں*

یہ شعر مولانا نورالدین ظہوری علیہ الرحمۃ اللہ علیہ کا ممدوح کی خوشنویسی کی تعریف میں ہے۔ مبالغہ سر حد تبلیغ اور غلو کو پہنچ گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کا لکھا ہوا قطعہ یا کوئی عبارت سو برس کی راہ پر سے آدمی کو نظر آتا ہے وجہ اس کی یہ کہ حرف بہت روشن صاف و جلی ہیں اور چونکہ یہ امر عجیب عادت و عقل ممتنع ہے اس رو سے اس کو معجزۂ قلم کہا ہے اور چونکہ معجزہ خرقِ عادت[1] ہے اور خرقِ عادات ایک امر ہے مسلمات جمہور میں سے پس منکر کو گنجائش انکار نہ رہی یہاں یہ خیال

---

[1] خلاف عادت

* یہ شعر عودِ ہندی صفحہ ۵۴ پر اسی طرح تحریر ہے۔

آئے گا کہ فیض تعلق برکار رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ حسن الہام ہے یعنی نگاہ کو از آنجا کہ باصرہ مشتاق حسن ہے اس خط سے وہ تعلق بہم پہنچا ہے کہ اگر وہ خط سو برس کی راہ پر ہو تو بھی نگاہ اس سے متعلق رہتی ہے جیسے طائر کو اپنا آشیانہ اور مسافر کو اپنا وطن اور عاشق کو معشوق کے خد وخال مسافت بعیدہ سے پیش نظر رہتا ہے چاہو ایک معلول کی دو علت سمجھو فیض تعلق مذکور اور حسن خط مقدر چاہو فیض تعلق کو ادعا کہو اور حسن خط جو تقدیر میں ہے اس کو سبب سمجھو تعلق کا اور موکد جانو ادعا کو۔ سنو دعوی کے واسطے دلیل موضوع ہے ادعا کو دلیل ضرور نہیں ہاں ادعا پر تاکید طریقہ بلاغت ہے یہ لطافت معنوی، خاص اس بزرگ کے حصہ میں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں مشتری عطارد نے مل کر ایک صورت پکڑی تھی۔ اوس کا اسم نور الدین اور تخلص ظہوری تھا۔ اللہ اللہ فرماتا ہے۔ شعر

مروّت کرد شبہا بر تو سر بام دور لازم
نمی باشد چراغے خانہائے بے نوایاں را

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا ملازمین میں سے کچھ لوگ زیر قصر رہتے ہوں اس واسطے بادشاہ دن کو اس منظر بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں اگر کوئی بلند مکان پر چڑھا تو کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی اور عفت فضیلت ہے فضائل اربعہ میں سے اب ایہام کو سوچئے ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے۔ اس واسطے کہ ان کے گھروں میں چراغ نہیں اگر کسی کو کسی کپڑے میں پیوند لگانا یا کوئی چھوٹے کی چیز گا نٹھنی یا کسی مریض کا تفحص حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے روشن

ہو جائے چراغ کی حاجت باقی نہ رہے جو کام جو شخص چاہے وہ کر لے مروّت کے لفظ کا مزہ وجدانی ہے سوائے اس لفظ کے کوئی اہم لفظ یہاں کام نہیں آتا۔ اگر حفظ ناموس رعایا ہے تو مروّت ہے اور اگر مفلسوں کی کاربر آری ہے تو مروّت ہے۔ غالب معنی کی جان ہے ظہوری ناطقہ کی سرفرازی کا نشان ہے ظہوری۔

زیادہ کیا لکھوں

(عود ہندی صفحات ۵۴/۵۶)

بندہ پرور!

بہت دنوں کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامہ پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا۔ خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمھارے دشمن بعارضہ تپ دق دلرزہ رنجور رہیں۔ اللہ اللہ ضعف کی یہ شدت کہ خط لکھنے سے معذور رہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمھارا خط تمھارے دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو۔ خط پڑھ کر دونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا دل سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔ آپ کے عم مقدار اور بزرگ آموزگار کو میرا اسلام مع صنوف[1] اشتیاق و الوف[2] احترام۔ جناب چودھری صاحب آؤ ہم تم حضرت صاحب عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ سلام کر دوں گا تم معترف ہونا کہ غالب یہی ہے اہل دلی میں۔ آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔ فرماتے ہیں کہ غالب تو اچھا ہے۔ عرض کرتا ہوں الحمد للہ حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے۔ ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری تعریف بہت کرتے رہتے ہیں۔ جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ

۱۔ جمع صنف یعنی طرح طرح کے اشتیاق

۲۔ جمع الف یعنی ہزارہا۔

کہتے ہیں۔ کاش وہ میری کا حال کہتے۔ ضعفِ قویٰ و اضمحلال کہتے، تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا ان کی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا۔ شعر

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا بیانہ تنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت سچ تو یوں ہے کہ غمہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل سے کسی طرح تسلی نہ پائی اب دو باتیں سوچا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی ادا کروں دوسری بات یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا یہ صغریٰ اور کبریٰ دلنشین ہے۔ نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

(عودِ ہندی صفحہ ۵۷/۵۹)

چودھری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام آپ کا خط کے سوائے چند سطر کے جو تم نے لکھی تھی سراسر حضرت صاحب کا دستخطی تھا پہنچا سبحان اللہ حضرت کو کس قدر محبت ہے تمھارے ساتھ۔ تمھاری ناسازی مزاج کا کیا ملال ہے اور تمھارے نہ دیکھنے کا کیسا رنج ہے۔ سچ یوں ہے کہ تم خوبان روزگار میں سے ہو توقیع قبول اہل نظر کا حاصل ہونا آسان نہیں ہے سلامت رہو۔ خوش رہو مختصر۔ مصرعہ

لہ کارت بجہاں جملہ چناں باد کہ خواہی

اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے۔ خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے تفقد نامۂ نامی میں صورت عز و شرف نظر آئی اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدر دانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق لطف لسان زبان پر آئی ہے۔ ورنہ قدر دانی کیسی یہ قدر افزائی نظیری علیہ الرحمۃ کا ایک شعر کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجئے اور زمرۂ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجئے۔ شعر یہ ہے۔

سے جوہر بینش من در تہ زنگار بماند آنکہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

لہ تمھارے سب کام دنیا میں تمھاری حسب منشا ہوں سے فخر

سے میرا جوہر بینش زنگار میں دبا ہوا رہ گیا۔ جس نے کہ میرا آئینہ بنایا افسوس ہے کہ اس نے اسے صاف نہیں کیا۔

دعویٰ اور جیب ہے ہنر اور کمال اور ہے علم عربی اور شے ہے اور فارسی کی حقیقت حال اور ہے رجلالائے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر یہ مضمون اوس کا ہے کہ ایک دن مولانائے عرفی علیہ الرحمہ اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ ہم نے تحقیق کو بہ سرحد افراد پہنچایا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔ عرفی نے کہا کہ اس کو کیا کروگے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گھر کے بڈھوں اور بڈھیوں سے جو بات سنی فارسی میں سنی شیخ گفت ما فارسی از انوری وخاقانی فرا گرفتہ ایم وشما از پیرزالان آموختہ آید۔ عرفی فرمود انوری وخاقانی نیز از پیرزناں آموختہ باشد۔[1]

غالب کہتا ہے کہ ہندستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور رہے۔ کلام اوس کا پسندیدہ جمہور رہے۔ دیکھو عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے زہے بیاہی قاتیل آرزو فقیر اور شیدا اور بہادر وغیرہم ایضیں میں آ گئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا منت اور نکہت اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔"

ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں خیر ہوں فاضل کہلائیں کلام میں ان کے مزا کہاں ایرانیوں کی سی ادا کہاں فارسی کی۔ قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے اس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔ باینہمہ وہ بھی جہاں

---

[1] شیخ نے کہا ہم نے فارسی انوری وخاقانی سے سیکھی اور تم بوڑھیوں سے اس پر عرفی نے جواب دیا کہ انوری اور خاقانی نے بھی بوڑھیوں ہی سے سیکھی ہوگی۔

پنے قیاس پر جاتا ہے منہ کی کھاتا ہے مولوی احسان اللہ ممتاز صنائع لفظی میں اچھی دستگاہ تھی اس شیوۂ روش کو خوب برت گئے ۔ فارسی وہ کیا جانیں ۔ قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے شاعری سے ان کو کیا علاقہ ایک بات حضرت کو معلوم رہے کہ ہندی فارسی والوں نے کمال کو وہم پر منحصر رکھا ہے کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیل کے شاگرد تھے میں نے ایک دفعہ قتیل کا ان کے نام دیکھا ہے قتیل ان کو لکھتا ہے کہ جامہ گذاشتن بمعنی مردن مسلم لیکن بہت احتیاط کیا کرو موقع دیکھ لیا کرو جب لکھا کرو ۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا ۔ فلاں مرد بہار جامہ گزاشت ۔ پھر وہ کہتا ہے کہ کدے کے ساتھ پانچ سات لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو وہ پھر فرماتا ہے کہ ہمہ کے لفظ کو جمع کے ساتھ لاؤ مفرد سے نہ ملاؤ نقل ہے ۔ میں نے دستنبو میں لکھا ہے کہ ہمہ کس داند ایک شخص نے کہ وہ بھی مولوی کہلاتا ہے میری غیبت میں کہا کہ ہمہ کس داند کیا ترکیب ہے ایک لڑکا میرا شاگرد وہاں موجود تھا اس نے کہا کہ یہ ترکیب بعینہٖ صائب کی ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے ۔ شعر

ہمہ کس طالب آں سرو رواں ست اینجا[1]

آب حیواں نفس سوختگاں ست اینجا

اس نے کہا تمھارا استاد حاش اللہ کو ماقبل کلمہ نفی لایا ہے اور یہ جائز نہیں ہے ع

حاش للہ کہ بدلی گویم

میرے شاگرد نے کہا کہ یہ ترکیب انوری کی ہے ؎

حاش اللہ نہ مرا بلکہ ملک را نہ بود باسگ کوے تو ایں زہرہ و یارا و مجال[2]

---

1. تمام آدمی اس سرو رواں کے عاشق ہیں اور آب حیات یہاں کے جلے ہوؤں کی خاک ہے ۔

2. خدا کی قسم مجھے ہی نہیں بلکہ فرشتوں کو بھی تیری گلی کے کتوں کے ساتھ مجال گفتگو نہیں ہے اور نہ یہ طاقت ۔

مولوی ہدایت علی تمکین کا آج تک میں نے نام نہیں سنا تھا پچھے ہوئے رستم ہیں۔ صائب اگرچہ ایرانی نژاد تھا مگر شاہ جہاں آباد تھا۔ انتقام کشیدن و انتقام گرفتن دونوں بول گیا۔ مولوی صاحب سچ فارسی بولتے ہیں۔ لاحول ولا قوت الا باللہ۔ کلیم بروزن فعیل صیغۂ اسم فاعل ہے مثل کریم و رحیم و بشیر و سمیع و بصیر و کلیم اسمائے الٰہی ہیں۔ کلیم اگر بمعنی ہمکلامی سمجھئے تو اسم الٰہی اس کو کیونکر قرار دیجے حضرت کا مصرعہ

ہمت کلامے ز کلام کلیم

مخدوش البتہ ہے یعنی یا کلمہ از کلام کلیم یا کلامے از کلمات کلیم چاہیے۔ کلامے از کلام مفرد میں سے مفرد کو نکالا چاہیے گو جائز نہ ہو۔ گویاش و گو باشد ہرگز محل تردد نہیں۔ اوہام و وسواس قواعد میں پیش نہیں جاتے۔ مصرعہ

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب

ہرگز یائے معروف نہیں ہے یائے مجہول ہے۔ یائے معروف یہاں نامعقول ہے

ع خدائے کہ بالا و پست آفرید

ایسا خدا ایسا کریم اس تحتانی کو یائے وحدت کہو۔ توصیف کہو۔ یائے تعظیم کہو جس طرح کہو مجہول آئے گی۔

عود ہندی صفحات ٦٠/٦٣

بندہ پرور!

پرسوں تمھارا خط آیا آج جواب لکھ رہا ہوں کل ڈاک میں بھجوا دونگا۔ میرا حال کیوں پوچھو اپنے کو دیکھو جو تمھارا ڈھنگ ہے وہی میرا رنگ ہے۔ بثور[1] اور اورام مرض خاص اور رنج عام یہ ایک اجمال ہے دوسرا اجمال سنو کہ مہینہ بھر سے صاحب فراش ہوں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں محلسرائے اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے ہو پھر کیا امکان جو جا سکوں صبح کو نو بجے کھانا یہیں آجاتا ہے پلنگ پر سے کھسل پڑا ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا پھر ہاتھ دھوئے کلی کی پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا اور پڑ رہا دنوں سے یہ مرض ہے کہ پیشاب جلد جلد آتا ہے۔ اب صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بدم تقاضائے بول کو دیکھو پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک بار جاتا ہوں مگر صعوبت کو تصور کرو ایک پھوڑا دائیں پہونچے میں جس کو ساعد کہتے ہیں دو پھوڑے بائیں پہنچے میں یہ سہل ہیں۔ بائیں پاؤں میں کف پا و پشت پا سے لیکر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی سخت۔ محللات[2] و روادع[3] سے کچھ نہ ہوا اب تجویز ہے کہ نیم کا بھرتا باندھے جب پکے پھوٹے تب مرہم لگایئے کہو جب کف پا میں جراحت کا عمل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا یہ حال جیسا کہ میں

۱۔ دانے پھنسیاں ۲۔ تحلیل کرنے والی دوائیں ۳۔ مادہ کو پھیر دینے والی دوائیں

اوپر لکھ آیا ہوں مجمل اور خبر ہے میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا اس رقعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام کو بھی ہندیوں کے اشعار کو قتیلؔ و واقفؔ سے لے کر بیدلؔ و ناصر علیؔ تک اس میزان میں تولیں میزان یہ ہے رودکی فردوسیؔ سے لے کر خاقانیؔ و نسائیؔ و انوریؔ وغیرہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے پھر حضرت سعدیؔ طرز خاص کے موجد ہوئے۔ سعدیؔ و جامیؔ و ہلالیؔ یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانیؔ ایک شیوۂ خاص کا مبدع[1] ہو خیالہائے نازک و معانی بلند اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوریؔ و نظیریؔ و عرفیؔ و نوعیؔ بھی سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا صائبؔ و کلیم و سلیم و قدسیؔ و حکیم شفائیؔ اس زمرہ میں ہیں رودکی و اسدیؔ و فردوسیؔ یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدیؔ کی طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانیؔ کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہریاں ہیں خاقانیؔ اس کے اقران[2] ظہوری اس کے امثال[3] صائبؔ اس کے نظائر خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے پس تو ہم نے جانا کہ طرز چوتھی ہے کیا کہنا خوب طرز ہے اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہندی ہے دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر

---

[1] نئی چیز پیدا کرنے والا۔ [2] جمع قرین [3] جمع مثل [4] اگرچہ بدیع نگار شاعر ایک پیالے سے بزم سخن میں مست ہیں مگر منکر نہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کے کلام میں شاعری کے سوا ایک اور چیز ہے۔

ہے داد و انصاف۔ نظم

اگرچہ شاعران نغز گفتار
زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں
خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز نہ جتنے میں پارسیوں کے آئی ہے ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمہ۔

بیت — بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو
رکھیگا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا بیت — دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم بیت — قائم اب تجھ سے طلب بوسے کی کیونکر مانگوں*
ہے تو نادان مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں۔ شعر — تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے ہاں کمتر آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز و نشتر ہیں مگر مجھے ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا یاد کیا آوے لیٹا ہوا ہوں دمبدم پانوں کے ورم کی ٹیس ہوش اڑائے دیتی ہے۔ اِنّا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ عود ہندی صفحات ۶۴/۶۶

---

* عود ہندی صفحہ ۶۶ پر لفظ "مانگوں" درج ہے نیز قائم کے بعد لفظ مانگوں تحریر ہے۔

اہاہا جناب منشی ممتاز علی صاحب مارہرہ پہنچے۔ صاحب وہ تو سیاہ گیتی نور ثانی مخدوم جہانیان جہاں گرد ہیں۔ بہر حال آپ نے دیباچہ بہت اچھا لکھا ہے کتاب کو اس سے رونق ہو جائے گی نظم میں وہ پایہ بلند کہ شعریٰ[1] پر لآلی[2] انجم نثار کرے خود بلا گرداں ہو۔ یوں ہی سہل ہر مصرع پر دل و جان سے وارے صدقے قربان ہوا کرے (بمعنی حملہ کرنے کے ہیں) اور وہ جو آپ کا مقصود ہے ان معنوں میں وارنا (وہ وارے) آیا ہے نہ وار کرنا اور وار کرے آپ کو یاد ہوگا کہ چند سطریں میں نے بہزار دشواری لکھ کر تمہیں بھیجی تھیں خواہش یہ تھی کہ یہی سطریں میرے مخدوم اور مخدوم زادہ کی نظر سے گزر جائیں۔ آج ایک خط میں نے پیر و مرشد کا اور پایا وہ بھی نہیں پڑھا مگر شاہ عالم صاحب اس خط کی پشت پر لکھتے ہیں کہ تو نے میرے خط کا جواب نہیں لکھا حالانکہ میں ان سطروں میں یہ لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت نہ اصلاح کا ہوش، ایک بات کو دس دس بار کیا لکھوں۔ اب میرا انجام کار دو طرح پر متصور ہے یا صحت یا مرگ، پہلی صورت میں خود اطلاع دوں گا دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سن لیںگے۔ یہ سطریں لیٹے لیٹے لکھی ہیں

(عود ہندی صفحات ۶۷/۶۸)

۱؎ ایک ستارۂ روشن کا نام ہے جسے ایام جاہلیت میں بعض قریش خدا سمجھ کر پوجتے تھے۔ واضح ہو کہ شعریٰ دو ہیں ایک بہت روشن جسے شعریٰ عبور کہتے ہیں۔ دوسرا ستارہ کم اسی وجہ سے شعرا نے اس کو غمیصا کہا ہے اس واسطے کہ وہ سہیل کی خواہر ہے کہ اس سے دور رہنے کی وجہ سے اس پر روتی ہے اور گویا اس کی آنکھیں چرک آلود ہیں۔

۲؎ ستاروں کے موتی۔

مکتوب بنام

مولوی عبدالرزاق شاکر

مخدوم مکرم مظہر لطف و کرم جناب اشرف الوکلا درویش گوشہ نشین غالب حزیں کا سلام۔ آپ کے عنایت نامے کے ورود میں آپ کا احسان مند ہوا اور دل سے آپ کو دعائیں دیں کیوں حضرت آپ حیران ہوئے ہوں گے کہ یہ شخص اتنا فضول اور لغو کیوں ہے۔ خط کے پہنچنے سے اظہار منت پذیری اگر گزاف[1] نہیں کیا ہے۔ اب اس خوشی اور دعائیں دینے کی وجہ سنیے۔ یعنی آپ کے سبب سے میں نے اپنے والا برادر جان عزیز تر بدل نزدیک واز دیدہ دور نا مہربان بخود مفرور میر احمد قاسم علی خان کا رقعہ اپنے نام کا پایا۔ اللہ اللہ اگر آپ باعث نہ ہوتے تو بھائی صاحب کاہے کو مجھ کو خط لکھتے۔ انھیں سے پوچھئے کہ کبھی تم نے اسد کو خط لکھا ہے؟ بس اس توضیح کے آپ کی تحریر کا جواب لکھتا ہوں۔ آپ کا واسطے اصلاح کلام کے رجوع کرنا میری طرف موجب نازش کا ہے۔ میرا طریق اس فن خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے اوس کو بدستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں اوس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آئندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح ہے۔ مطلع کا یہ مصرع

سرخوشش و سرشار مستم یللتی

لسان فارسی میں سرشار صفت ہے پیالے کے معنی لفظی اس کے لبریز۔ پس شاد ب کو لبریز

---

[1] جھوٹ۔ شیخی

کیونکر کہیں گے اور یہ جو اُردو مست و سرشار مترادف المعنی استعمال میں آتے ہیں امر جداگانہ ہے فارسی میں تتبع اس کا ناجائز۔ رند عالم سوز شعرائے عجم میں بمعنی رند بے نام و ننگ آیا ہے جیسا کہ استاد کہتا ہے۔ مصرعہ

زنگ عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار

حسن مطلع سست تھا۔ میر سدر باده۔ الخ۔ بر شیشہ یہاں انسب ہے۔ اولحد جوں خاک جستم۔ خاک کو جستن سے کیا علاقہ! (نقد جاں را مہر بنتم یلیلی) تعقید معنوی ہے۔ طالب عہد الستم۔ طالب الست۔ یعنی عہد الست کس سے مانگتا ہے۔ ہاں سرخوش عہد الست بہ محل و بہ موقع۔ متوقع ہوں کہ میرا یہ رقعہ جو آپ کے نام کا ہے جناب میر قاسم علی خاں صاحب کو پڑھا دیجیے گا اور اب جو آپ مجھے خط لکھیں تو یہ بھی لکھیے گا کہ ہنوز وہ صدر امین ہیں یا ترقی کی اور صدر الصدور ہو گئے اور اگر ترقی نہیں کی تو کیا وجہ۔

(عود ہندی صفحات ۲۱۸/۲۱۶)

جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد الرزاق صاحب شاکر کی خدمت میں فقیر کا سلام پہونچائیے میں تو آپ سے عرض کرتا ہوں مگر آپ مفتی صاحب سے کہیے کہ مجھ کو باوجود شدت نسیان آپ کا تشریف لانا یاد ہے۔ چھاپے کے اجزا اٹھا کر میں نے آپ کے سامنے ایک غزل پڑھی تھی جس کے دو شعر قطعہ بند ہیں۔ قطعہ

ے از زند گوہرے چو من اندر زمانہ نیست
خود را بہ خاک رہگذر حیدر افگنم
منصور فرقۂ علی اللّٰہیاں منم
آوازہ انا اسد اللّٰہ در افگنم

خدا کرے حضرت کو بھی یہ واقعہ یاد ہو اتحاد اسمی دلیل مودت روحانی ہے۔ اخی مکرمی میر قاسم علی خان کو میرا سلام پہنچے سال گزشتہ کی تعطیل کی طرح دلی آکر مجھ سے بے ملے نہ چلے جائیے گا۔ پھر حضرت الیہ سے کلام ہے اشعار بعد حک و اصلاح کے پہنچتے ہیں یہ رتبہ میری ارزش[2] کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں۔ بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سری و ضعف کے صدقوں سے

---

[1] مجھ سا قیمتی موتی اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو حضرت علی کے راستے کی خاک پر ڈالتا ہوں۔ نصیری کی جماعت کا میں منصور ہوں۔ لہذا انا اسد اللہ کا نعرہ لگاتا ہوں۔

[2] قیمت۔

محنت شروہی و جگر کاری کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت عزیزی[۱] کو زوال ہے
اور یہ حال ہے۔ شعر

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتب لکھے اور بھیجے تھے ان میں جو صاحب الی الآن ذی حیات موجود ہیں ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے۔ پارسی مکتوبوں و رسالوں و نسخوں و کتابوں کے مجموع شیرازہ بستہ چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے جانکنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر و تعلق وبار سے دست بردار و آزاد و سبکدوش کر دیا۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں انھیں کو جناب احدیت جلّت عظمتہ مقبول قلوب اہلِ سخن و مطبوع طبایع ارباب فن فرمائے اور میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہونچ کر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں کچھ یاد خدا بھی چاہیے نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہیگا۔ بس امیدوار ہوں کہ آپ انھیں نذور محقرہ یعنی تحریرات روزمرّہ اردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش و فرماندہ کشاکش

---

[۱] اصلی حرارت

معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوائے ہوس۔ تعقید معنوی کو حضور خود جانتے ہوں گے اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لاطائل کی صورت نظر آتی ہے لہذا خامہ فرسائی بروئے کار نہیں آئی۔

(عود ہندی صفحات ۲۱۹/۲۲۱)

حضرت!

مطالب علمی و شعری کا لکھنا موقوف سوال پر ہے۔ جب حضور کی طرف سے کوئی سوال آئے گا بقدر اپنے معلوم کے جواب لکھا جائے گا۔ شعر

ہیں اپنے گستہ مزیل امید
ایماں کہاں ہے ایک ڈر ہے

اس شعر میں قصد اچھا ہے مگر بیان ناقص ہے۔ مطلب تو ہے کہ صرف خوف اصل ایمان نہیں ہے رجا کا بھی شمول چاہیے اور یہ بات اس تقریر میں سے نکلتی نہیں۔

(عود ہندی صفحہ ۲۲۱/۲۲۲)

پیر و مرشد

مصرعہ ایک[1] شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے، یہ خبر ہے۔
پہلا مصرع۔ مصرعہ: ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے۔ یہ مبتدا[2] ہے شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمت غلیظ سحر ناپیدا گویا خلق ہی نہیں، ہاں دلیل صبح کی بود پر ہے۔ بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے منجملۂ اسباب تاریکی کے پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔ شعر

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھو روانی میری

تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا نور و ظلمت شادی و غم، راحت و رنج وجود و عدم لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنے مرجع کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روے خوب و عادت ضد ہمد گر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا۔ غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں۔ والسلام

(عود ہندی صفحہ ۲۲۲)

---

[1] دیوان اردو میں "اک" ہے اور یہی صحیح ہے۔ [2] شروع۔ اول۔ جزو جملہ اسمیہ

حقیر فقیر اسد اللہ نے اس کاغذ کے لفافہ پر مرسلۂ محمد عبد الرزاق جعفری الحیدری اور ٹکٹ پر شاکر دیکھ کر دیر تک غور کی کہ یہ دو صاحب ہیں بعد تامل یاد آیا کہ مولوی عبد الرزاق صاحب اسم شریف اور شاکر تخلص ہے غور کیجئے کہ نسیان کا کیا عالم ہے واللہ اگر مجھ کو یاد ہو کہ سابق میں کوئی غزل آپ کی آئی ہے۔ یہ لفافہ یکم اگست سال حال کا کل میں نے ڈاک سے پایا آج غزل کو دیکھا کل یہ لفافہ روانہ کر دوں گا۔ شعر

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمتا ہو کر
آئینہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دلنشیں ہے مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہا چاہیے یا نہیں۔ شعر

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا
بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

مردم یعنی آنکھ کی پتلی۔ مذکر نہیں معشوق کی قید کیا ضرور ہے دعوے حسن پرستی ہے عموماً یہ خوب شعر ہے۔ شعر

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشم سیاہ
بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

شعر

حرمت مے کے لیے پیر مغاں کا ہے یہ حکم
ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لطف ہو گیا ہے کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش ہی کو وہ ایہام ریش کہاں رہا۔ تین شعر۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ، داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ، ناشگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بےتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

کارگاہِ ہستی الخ داغ ساماں مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر نمایش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجے کہ پھول کے درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے۔ دہقان کو جوتنے بونے اور پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے مضارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج غنچہ الخ کلی جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگ عافیت معلوم یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگ عافیت بہ معنی مایۂ آرام۔ مصرعہ

برگِ عیشی بگورِ خویش فرست

برگ اور برگ و برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گل شخصیت گل باعتبار خموشی و برجا ماندگی پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا غنچہ بصورتِ دل جمع ہے باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے

ہم سے رنج اٹھانا پشت دست صورت عجز اور حسن بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو ہم سے رنج واضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔

قبل ابتدائے فکر سخن میں بیدلؔ اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔

بندہ پرور! اصلاح نثر کی ضرورت نہیں آپ کی انشا کی یہ روش خاص دلچسپ اور بے عیب ہے اس وضع کو نہ چھوڑیے اور جو میرا تتبع اور مجھ پر توجہ منظور ہو تو پنج آہنگ وغیرہ میری مصنفات کو بامعان نظر و صرف ہمت ملاحظہ فرمائیے اور مشق بڑھائیے چشم بد دور طبیعت حضور کی نہایت عالی اور مناسب اس فن کی ہے۔ میں آپ کی رسائی ذہن اور قوت قلم سے امید قوی رکھتا ہوں کہ عنقریب بہت خوب لکھے گا میرے اور تمام دوستوں کے فخر اور دشمنوں کے رشک ہو جائیگا ان ہذا الامن برکۃ العلم یا مولانا وبالفعل والکمال اولانا۔

(عود ہندی صفحات ۲۲۳/۲۲۴)

قبلہ آپ کو تو یہ معلوم ہو گا کہ ۸ رجنوری کو فقیر دلی پہنچا تھکا ماندہ خستہ رنجور ہنوز اقامت کلی نہیں پائی۔ آج صبحدم ہوا بند ہے دھوپ تیز ہے پشت آفتاب تکیے کے سہارے بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ غزل بہت بختی ہے، گوند میں تھر کر ایک ٹکڑا کاغذ کا الگ ہو گیا ہے۔ حضرت باحتیاط اوس کو لفافہ سے نکالیں۔ بیت ہے۔

تمھارا آفتابہ آفتاب آسماں
دیکھ لو اپنی چلمچی میں حباب آسماں

اگر پسند آئے تو اس مطلع کو یوں رہنے دیجیے۔ مولوی نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر طالب علموں کے ہاتھ پڑا انھوں نے از روئے قواعد نحو اوس میں کلام کرنا شروع کیا مولوی کے پاس جب وہ کلمات پہنچے تو فرمایا کہ "یاران شعرا بمدرسہ کہ برد"

جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مجموع پہلا مصرع متبداء نہیں ہو سکتا ان سے پوچھنا چاہیے کہ کیا آپ اسی پہلے مصرع میں سے (ظلمتکدے میں میرے) اوسکو متبداء اور (شب غم کا جوش ہے) اوس کو خبر ٹھہراتے ہیں۔ بس اگر یوں ہے، تو بھی مدعا حاصل ہے۔ دوسرا مصرع دوسری خبر سہی آخر یہ بھی تو مسلمات فن نحو میں سے ہے کہ ایک متبدا کی دو بلکہ زیادہ خبر ہو سکتی ہے۔ ہاں ایک قاعدہ اور ہے یعنی

جملہ فعلیہ کے ماقبل جو عبارت ہوتی ہے اوس کو مبتدا نہیں کہتے اس مطلع کا مصرعِ ثانی جملہ اسمیہ ہے اپنے ماقبل مبتدا کو قبول کرتا ہے اگر ہم نے نظر اس دستور پر مصرعہ اول کو مبتدا کہا تو بھی قباحت لازم نہیں آتی بہر حال جو وہ صاحب اسی پہلے مصرع کو قرار دیں وہ مجھے قبول ہے۔ مگر شعر میرا مہمل نہیں۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ بھائی میر قاسم علی خاں صاحب کو بندگی۔

(عود ہندی صفحہ ۲۲۷)

قبلہ پہلے معنی ابیات بے معنی سنئے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ایران میں رسم ہو کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے۔

شوق ہر رنگ ۔۔۔ الخ

رقیب بمعنی مخالف یعنی شوق سرو سامان کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر بانتن عریاں ہی کھینچتی ہے جہاں کھینچتی ہے۔

زخم نے داد الخ

یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں۔ شعر

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے

یعنی زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب

ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو پرفشاں بمعنی بیتاب اور بہ لفظ تیر کے مناسب حال معنی یہ کہ تیر تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیق کے مقام سے گھبرا کر پرفشاں اور سراسیمہ نکل گیا غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامے میرٹھ کا رہنے والا دس برس سے اندھا ہو گیا ہے کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے اہل دل کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو رسالہ اس کا سا طبع برہان دلی پہونچ کر ڈھونڈوں گا اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا جناب مستطاب میر قاسم علی خان صاحب صادق القول ہیں میرے گھر آئے ہوں گے دروازہ بند پایا ہو گا مگر ایک خدشہ ہے کہ حضرت اور میرے بھائی مرزا علی بخش خاں میں بہت ربط و اتحاد ہے اور وہ مرحوم خداایش بیامرزاد گوب دگزاف میں ضرب المثل تھا اس تصور سے اگر میں اس جملے کے سچ جاننے میں تامل کروں تو میرا تامل بیجا نہ ہو گا۔ بہر حال ان کو میرا سلام کہنا سیلاب جبین ایک لفظ ہے ہندیاں فارسی داں کا اصل لغت چلمچی اور یہ لغت ترکی ہے معہذا حباب آسمان جب تک کہ آسمان کو بحر یا دریا نہ کہیں حباب آسمان نہ مقبول نہ مسموع وفات مسموع ہے اگر فتحۂ الف کا اشباع جائز ہو ورنہ وفات پروری کی جگہ ادائی پروری بہتر ہے بلکہ وفات یا وفا ات بہر حال صفت ہے۔ پرورش موصوف کی چاہیے نہ صفت کی۔

والسّلام

(عود ہندی صفحات $\frac{226}{227}$)

مکتوب بنام

مرزا حاتم علی مہرؔ

بہت سہے غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقیِ کوثر ہوں مجکو غم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

علاقۂ محبت ازلی کو برحق مان کر اور حقوق غلامی جناب مرتضیٰ علی کو سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشنائی ہی اس کے اجارے میں آئی ہے یہ بھی دلیل آشنائی ہے کیا فرض ہے کہ جبتک دید وا دید[1] نہ ہو اپنے کو بیگانہ ایکدگر سمجھیں البتہ ہم تم دوست دیرینہ ہیں اگر سمجھیں۔ سلام کے جواب میں خط میرا احسان ہے خدا کرے وہ خط جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا تھا آپ کی نظر سے گزر گیا ہو اچھا نا اگر نہ دیکھا ہو گا تو اب مرزا تفتہ سے لے کر پڑھ لیجیے گا اور خط کے لکھنے کے احسان کو اس خط کے لینے سے دو بالا کیجیے گا۔ ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا سچ ہے اس کا یہ شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی ترغیب دلواتا بندہ پرور یہ بھی انھیں میں سے ہے جن کا میں ماتمی ہوں ہزار ہا دوست مر گئے کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غم خوار نہیں مروں تو کوئی

---

[1] ملاقات باہمی

عزل اوار نہیں غزلیں آپ کی دیکھیں سبحان اللہ، چشمِ بد دور اردو کی راہ کے تو سالک ہو گویا اس زبان کے مالک ہو فارسی بھی خوبی میں کم نہیں مشق شرط ہے اگر کہے جاؤ گے لطف پاؤ گے میرا تو بقول طالب آملی اب یہ حال ہے۔

لہ لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمی بود و بہ شد

(عودِ ہندی صفحہ ۱۴۴)

لہ میں نے بات کرنے سے ایسی لب بند کرلی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ منہ چہرہ پر ایک زخم تھا جو اب بھر گیا۔

مرزا صاحب!

میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے اتنا تو کہو یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی برسوں ہو گئے کہ تمھارا خط نہیں آیا نہ اپنی خیر و عافیت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انھوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے یہ تو بہت دن ہوئے جو تم نے خبر دی ہے کہ دو کتابوں کی طلائی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا وہ لکھتے ہیں کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمھارے پاس پہونچ جائیں گی اب حضرت ارشاد کریں کہ یہ سات جلدیں کب آئینگی ہر چند کارگیروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے یہ سات جلدیں آپ کی عنایت بھی آئیں تا خاص و عام جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر

لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری لکھوا لیا اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ اور صلہ میں اس کے جواب چاہتا ہوں۔ غزل

درد منت کش دوا نہ ہوا — یہ نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی[1] — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان بھی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں[2] — آج غالب غزل سرا نہ ہوا

(عود ہندی صفحات ۱۵۴/۱۵۵)

---

[1] نمرود ایک بادشاہ گذرا ہے جس نے دعویٰ خدائی کیا تھا وہ اتنا ظالم و جابر تھا کہ جو کوئی اسے خدا تسلیم نہیں کرتا تھا اس پر وہ بے انتہا مظالم ڈھاتا تھا۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ اس خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی نمرود کا عہد حکومت تو نہ تھی جس میں مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس خدائی میں تو میری آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہونی چاہئے تھیں۔ بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ بندہ ہوتا ہے۔

[2] اسی غزل کا مقطع
یہ غزل قلعۂ معلیٰ کے مشاعروں میں پڑھی گئی۔ مشاعرہ طرحی ہوا کرتا تھا مگر چونکہ غالب نے طرح پر غزل نہیں کہی تھی اس لئے لوگوں کے اصرار پر دہیں یہ غزل کہہ کر سنا دی جس کا اظہار مقطع میں ہے

بندہ پرور!

آپ کا خط کل پہنچا آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم واندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پہ دل آیا ہے تو شکایت کی گنجایش کیا ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں در خود افزایش ہے بقول غالب علیہ الرحمۃ بہ بیت[1] ؎

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

ہے ہے یہ شعر ؎

---

[1] ان دنوں دو غزلیں لکھی ہیں ایک تو "دریا نہ ہوا" سو وہ آپکے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل "رازداں کیوں ہو" اب بھیجتا ہوں۔

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔ اور اگر خدا نخواستہ باشد غم دینا ہے تو بھلائی ہمارے ہمدرد ہو ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو بقول غالب مرحوم۔ شعر ؎

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

"سحر ہو گی" "خبر ہو گی" اس زمین میں یعنی وہ شعر۔ شعر

تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر
جو آنکھوں میں تمھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہو گی

کتنا خوب ہے اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔ قصیدے کا مشتاق ہوں خدا کرے جلد چھپ جائے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آئے۔ کیا کہیے، بھلا کہیے! یہ زمین ایک بار یہاں طرح ہوئی تھی مگر بحر اور ہی تھی۔ غالب۔ اشعار

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کہیے

اور وہ جو فعلاتن، فعلاتن، فعلن۔ یہ بحر ہے اس میں ایک میرا قطعہ ہے وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست

تھے انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی تشبیہات نظم کیجیے میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہہ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی ۔ اب سوچ رہا ہوں جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں ۔ قطعہ ؎

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی | زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں، کہ اسے کیا لکھیے | ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے | خال مشکین رخ دل کش لیلیٰ کہیے
حجر الاسود دیوار حرم کیجے فرض | نافہ آہوے بیابان ختن کا کہیے
صومعہ[1] میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز[2] | میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے
مسی آلود سر انگشت حسیناں لکھیے | سر پستان پری زاد سے ماننا[3] کہیے

غرض بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں ۔ اخیر کی بیت یہ ہے ؎

اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجے فرض | اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

تو حضرت آپ کے خط کے جواب نے انجام پایا۔ اب میرا درد دل سنو۔ برخوردار منشی شیو نرائن نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا اور وہ خطوط جواب طلب تھے۔ تم ان کو میری دعا کہیو اور کہیو کہ یہاں میرا کام بند ہے اس مطلب خاص کا جواب جلد لکھو یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے تو جلد بھیجو اور اگر اس کے بھیجنے میں دیر ہو تو یہ لکھ بھیجو کہ وہ سیاہ قلم کی لوح کی ہے یا طلائی ہے ۱۲

(عود ہندی صفحات ۱۵۷/۱۵۹)

---

[1] عبادت گاہ نصاریٰ [2] مسجدہ گاہ [3] مشابہ

خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں۔ مرزا تفتہ کا خط جو آپ نے نقل کر کر بھیج دیا ہے۔ میں نے منشی شیونرائن کا بھیجا ہوا اصل خط دیکھ لیا ہے۔ اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو، رقعات عالمگیری یا انشا، خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے وہ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمہارے خط آنے کا نام ہو جایا کریگا اگر کبھی کوئی قصیدہ کہا اس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف رہا۔ مصرعہ

برات عاشقاں بر شاخ آہو

واقعی جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھکو بتاؤ کہ یہاں جو پارسیوں کی دکانوں میں فرنچ اور شام پین کے درجن دھرے ہوئے ہیں یا ساہوکاروں کے اور جوہریوں کے گھر روپے اور جواہر سے بھرے ہوئے ہیں کہاں وہ شراب پیتے جاؤں گا اور وہ مال کیونکر اٹھاؤں گا۔ بس اب زیادہ باتیں نہ بنایئے اور وہ قصیدہ مجھ کو بھجوایئے۔ میں نے کتابیں جابجا بسبیل پارسل ارسال کی ہیں اگرچہ پہونچنے کی خبر پائی ہے مگر نوید قبول ابھی کہیں سے نہیں آئی ہے شعر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیا ہے

جو اسے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو سمجھیں ہم لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

غزل ناتمام سے غزل

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے
لے آئینگے بازار سے جاکر دل و جاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

پاتے ہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند کہ سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

دوشنبہ کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے انگیٹھی رکھی ہوئی ہے آگ تاپ رہا ہوں
اور خط لکھ رہا ہوں یہ اشعار یاد آ گئے تم کو لکھ بھیجے والسلام

(عود ہندی ۱۵۹/۱۶۱)

بندہ پرور!

نبقر شکوہ سے برا نہیں مانتا مگر شکوہ کے فن کو سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ شکوہ کی خوبی یہ ہے کہ راہ راست سے منہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب کی گنجایش نہ چھوڑے۔ شعر ؎

خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است
آید بزبان ہر آنچہ از دل برود

(عودِ ہندی صفحہ ۱۶۲)

لہ خود شکایت آزار کے رفع کرنے کی کافی دلیل ہے۔ کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ زبان پر آتی ہے۔

جناب مرزا صاحب!

آپ کا غم افزا نامہ پہونچا۔ میں نے پڑھا یوسف علی خان عزیز کو پڑھوا دیا۔ انھوں نے میرے سامنے جو اس مرحومہ اور آپ کا معاملہ بیان کیا۔ یعنی اس کی اطاعت اور تمھاری اس سے محبت۔ سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔۔۔۔ جانتا ہوں تمھارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ سازی عشق مجازی چھوڑ دو۔ بیت

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمد بس است و آل محمدؐ

اللہ بس ما سوائے ہوس۔

(عودِ ہندی صفحہ ۱۶۵)

مکتوب بنام

پیارے لال آشوب

ماسٹر پیارے لال آشوب کو ایک خط تحریر کرتے وقت غالب شعر کی شرح خود کرتے ہیں۔

یک الف بیش نہیں، صیقل آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جیسے کہ گریباں سمجھا

پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت ہے فولاد کے آئینہ سے، ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اوس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔ مصرعہ

چاک کرتا ہوں میں جیسے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنوں ہے ابتک کمال فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس ایک لکیر صیقل کی ہے۔ جو ہے سو ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے۔

(مرقع غالب مرتبہ پرتھوی چند) صفحہ ۱۴

مکتوب، بنام

نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفقؔ

قبلہ و کعبہ

کیا لکھوں امور نفسانی میں اضداد[1] کا جمع ہونا محالات عادیہ[2] میں سے ہے کیونکر ہو سکے کہ ایک وقت خاص میں ایک امر خاص موجب انشراح بھی ہو اور باعث انقباض[3] کا بھی ہو یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں پائی کہ اس کو پڑھ کر خوش بھی ہوا اور غمگین بھی ہوا سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو اپنا طالع پاتا ہوں عزیزوں کی ستم کشی اور رشتہ داروں سے ناخوشی میرا ہم قوم تو سراسر قلمرو ہند میں نہیں سمرقند میں دو چار یا دشت قفچاق میں سو دو سو ہوں گے مگر ہاں اقربا سے پانچ برس کی عمر سے اللہ کے دام میں اسیر ہوں اکسٹھ برس ستم اٹھائے ہیں۔ شعر

[4] گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں برخیزد

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں۔ ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے بیڑا پار ہے۔

---

1 متضاد چیزیں 2 وہ باتیں جن کا واقع ہونا عادتاً محال ہو۔ 3 رنجیدہ ہونا

4 اے غالب، اگر اپنے اقربا اور اعزہ کے مظالم کی شرح لکھوں۔ تو یقیناً امید کی رسم دنیا سے اٹھ جائے گی۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے، دکھلائیں کیا

یہ بھی تو پوچھو کہ آپ کے خط کا جواب اتنی جلد کیوں لکھا یعنی کم و بیش مہینہ بھر کے بعد کیا کروں، شاہ اسرار الحق کو آپ کا اور حافظ نظام الدین صاحب کا خط بھجوا دیا ہفتہ بھر کے بعد جواب مانگا جواب دیا کہ اب بھیجتا ہوں دس بارہ دن ہوئے کہ حضرت خود تشریف لائے جواب آپ کے اور حافظ جی کے خط کا مانگا کہا کل بھیجدوں گا اس واقعہ کو آج قریب دو ہفتے کا عرصہ ہوا نا چار ان کے جواب سے قطع نظر کر کے آپ کو یہ چند سطریں لکھیں۔

لہ از خون دل نوشتم نزدیک دوست نامہ
انّی رایت دہرا " فی ہجرک القیامہ

(عود ہندی صفحات ۷۴/۷۵)

لہ میں نے دوست کے پاس خون دل سے نامہ لکھ کر بھیجا ہے کہ تیری جدائی میں میں نے دنیا میں قیامت دیکھی ہے۔

کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں نہ القاب نہ آداب نہ بندگی نہ تسلیم سن غالب ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن ایاز حد خود بشناس[1]۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد رات کو دونوں بیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکریہ ادا کر اور یہ کہا کر کہ جو میں تصور کر رہا تھا وہ ہوا۔ یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہونچا معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی موسم اچھا آگیا ہے۔ شعر ؎

[2] گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز ہوا

محمل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد

اگر تبرید[3] تعدیل[4] سے کام نکل جائے تو کیا کہنا ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ[5] کرائیے۔ مجھ کو بھی

---

[1] ایک فارسی ضرب المثل ہے۔ اے ایاز تو اک غلام ہے اپنی حد کو پہچان لے۔

[2] پانی سے گرمی اور ہوا سے حرارت رفع ہو گئی۔ آفتاب کی سواری برج میزان میں آگئی۔

(میزان میں آفتاب غازی سردی ماہ کنوار میں جاتا ہے) [3] ٹھنڈائی

[4] مزاج کا معتدل کرنا [5] مسہل

آج دسواں منضج[1] ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ شب کو ناگاہ ایک نئی زمین خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی غزل تمام کی اسی وقت سے یہ خیال تھا کہ کب صبح ہو اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیجدوں۔ خدا کرے آپ پسند کریں اور میرے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سنادیں اور میرے شفیق نادر حسین خاں صاحب اور ان کے بھائی اس کو پڑھیں پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے غزل ؎

[2] اے ذوق نوا سنجی بازم بہ خروش آور
غوغائے شبیخونے بر بنگہ ہوش آور

---

[1] وہ دوائیں جو مسہل سے پہلے دی جاتی ہیں [2] اے نوا سنجی کے ذوق پھر مجھے آمادۂ شورش بنادے اور میرے ہوش پر پھر شبخون مار۔ اگر خون سر سے نہ نکلے یعنی فوارہ نہ اچھلے تو اسے آنکھوں کے راستے سے زمین پر برسادے ؛ دل کا خون کر اور اس خون کو سینے میں جوش زن کر۔

ہاں اے عقل مند دوست تو ویرانہ کا راستہ جانتا ہے ایسی شمع لا جو ہوا سے نہ بجھ سکے۔

اس وادی کے کھاری پانی کا چشمہ بہت تلخ ہے۔ اگر تو دیر ہے تو شہر سے مجھ تک شیریں چشمہ لا۔

مجھے معلوم ہے کہ تیرے پاس زر ہے اور ہر جگہ تیری رسائی ہے۔ اگر بادشاہ شراب نہ دے تو کلال کی دکان سے لے آ۔ اگر شراب تو بنی میں عنایت کرے تو اسے ہاتھ پر رکھ کر چل دے اور اگر بادشاہ سبو میں عنایت کرے تو کاندھے پر رکھ کرلے آ

سبزہ مینا سے اگتا ہے اور نغمہ قلقل سے ٹپکتا ہے سبزہ کو آنکھ کی راہ میں ڈال دے اور یہ کان کے لیے لا۔

کبھی جلدی سے اس شراب کی تاثیر سے مجھے بے خود بنادے۔ کبھی سیہ مستی کی حالت سے نغمہ سنا کر مجھے ہوش میں لے آ۔

غالبؔ، کہ اسے خدا زندہ رکھے اگر ہمراہ نہ آسکے تو خیر اس کمبل پوش درویش سے کوئی غزل یا کوئی شعر ہی لے آ۔

گر خوں نہ جہد از سر از دیدہ فرو بارش
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور

ہاں ہمدم فرزانہ دانی رہ ویرانہ
شمعے کہ نہ خواہد شد از باد خموش آور

شورابۂ ایں وادی تلخ ست اگر داری
از شہر بسوے من سرچشمۂ نوش آور

دانم کہ زری داری ہر جا گذرے داری
مے گر نہ دہد سلطاں از بادہ فروش آور

گر مے بگدازد ریزد بر کف نہ زرا ہی شو
در شیشہ بہ شبو بخشد بردار و بدوش آور

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں دورہ چشم افگن ویں از پے گوش آور

گاہے بہ سبکدستی زاں بادہ ز خویشم بر
گاہے بہ بیہ مستی از نغمہ بہ ہوش آور

غالبؔ کہ بقایش باد ہم پاے اگر ناید
بارے غزلے فردے زاں موئنہ پوش آور

(عودِ ہندی صفحات ۷۶-۷۷)

قبلہ و کعبہ! وہ عنایت نامہ جس میں حضرت نے مزاج کی شکایت لکھی تھی
پڑھ کر بے چین ہو گیا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ مزاج کا حال مفصل
لکھیے۔ چونکہ آپ نے کچھ نہ لکھا تو اور زیادہ مشوش ہوں۔ نسخہ رفع تشویش
یعنی شفقت نامہ جلد بھیجیے جناب منشی نادر حسین خان کا کچھ حال معلوم نہیں
حضرت میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں۔ متوقع ہوں کہ ان دونوں
صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچے اور آپ ان کی خیر و عافیت لکھیں۔
کبوتروں کا نسخہ جیسا کہ میرے پاس آیا بجنسہ ارسال کرتا ہوں آپ کو معلوم ہو گا
کہ میرن صاحب نے انتقال کیا یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر لکھنؤ کے نام ان کا
سید حسین اور خطاب سید العلماء، نقش نگین میر حسن ابن علی میں نے ان کی رحلت کی
ایک تاریخ پائی اس میں پانچ بڑھتے تھے یعنی ۱۲۷۰ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روش کا
میرے خیال میں آیا میں تو جانتا ہوں اچھا ہے دیکھوں اب پسند فرماتے ہیں یا نہیں قطعہ

حسین ابن علی آبروے علم و عمل
کہ سید العلما نقش خاتمش بودے
نماند ماندی اگر زندہ پنج سال دگر
غم حسین علی سال ماتمش بودے
۱۲۷۳ھ

زیادہ حد ادب۔ (عود ہندی صفحہ ۸۰)

پیرومرشد!

ایک نوازش نامہ آیا اور دستنبو کے پہنچنے کا مژدہ پایا اس کا جواب یہی ہو کہ کارپردازانِ ڈاک کا احسان مانوں اور اپنی محنت کارائگاں نہ جانا یقین جانوں۔ چند روز کے بعد ایک عنایت نامہ پہنچا گویا ساغر التفات کا دوسرا دور پہنچا اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اس ستارہ دم دار کا لکھوں چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں چونکہ بسبب فقدان[1] یعنی عدم رصد[2] کتاب کچھ نہیں کہا جاتا ناچار مرزا صاحب کا مصرعہ زبان پر آجاتا ہے۔

[3] ازیں ستارۂ دنبالہ دار می ترسم

یہ مطلع ہے اور پہلا مصرع یہ ہے۔

[4] زحال گوشۂ ابروئے یاری ترسم

[1] گم ہونا

[2] رصدگاہ (OBSERVATORY) ایک قسم کی بلند عمارت جو پہاڑ کی بلندی پر اس لیے بناتے ہیں تاکہ وہاں سے بیٹھ کر دوربینوں سے ستارگان کی گردش کا حال معلوم کریں۔ اس کا تعلق علم نجوم سے ہے

[3] میں اس ستارۂ دمدار سے ڈرتا ہوں

[4] ابروئے یار کے گوشۂ تل سے میں ڈرتا ہوں

آپ مجھ کو بے ہنری اور بیمغزی[1] میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں جانتے بپیش[2] ملا طبیب و بپیش طبیب ملا ہیچ ہر دو بپیش ہیچ ہر دو آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدہ کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ[2] دیکھتے ہیں پھر ذوذنابہ[3] کا حمر[4] اور طریقہ دیکھتے ہیں ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہاں آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ ان دنوں آفتاب اول میزان میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے درجہ اول اور دقیقہ کی حیثیت نامعلوم رہی بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ ابا

---

۱ وہ جس کی قدر وقیمت نہ ہو

۲ اصطلاح نجوم میں درجہ کے ساٹھویں حصے کو کہتے ہیں۔ آسمان کے بارہ برج مقرر کیے ہیں اور ہر برج کے تیس درجے اور ہر درجے کے ساٹھ دقیقے اور ہر دقیقے کے چھ سو ثانیے۔

۳ ستارۂ منحوس جو بہ شکل جاروب کبھی کبھی نکلتا ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ اگر طلوع کے وقت اس کی شعاعیں مشرق کی طرف ہوں تو ذوذابہ کہنا اولیٰ ہے۔

۴ حمر۔ (عربی) جمع احمر معنی سرخ چیزیں۔ طریقہ اصطلاح نجوم میں قمر کا پندرہ درجہ کا انیس درجہ میزان سے مسافت طے کرنا جو کہ ہبوط شمس کا محل ہے تیسرے درجہ عقرب تک جو ہبوط قمر کی جگہ ہے اور اس مدت کو جو ایک رات دن اور دوپہر کی ہوتی ہے طریقہ محترقہ کہتے ہیں جو نہایت منحوس ہے۔

اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا وہاں شاید اب نظر آیا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی ہیں۔ قران النحسین[1] پھر خسوف[2] پھر یہ صورت بہمہ کدورت عیاذاً باللہ پناہ بخدا یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور سب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنا گیا نواب گورنر جنرل لارڈ لیننگ بہادر کو ملکۂ معظمہ انگلستان نے فرزند ارجمند خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا ہیں تو قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں چنانچہ بشمول دستنبو نظر اقدس سے گزرا ہوگا۔ شعر

[3] تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

اللہ۔ اللہ۔ اللہ

(عود ہندی صفحات $\frac{۸۲}{۸۴}$)

---

[1] دو منحوس ستاروں کا قران
[2] چاند گرہن (کسوف سورج گرہن)
[3] دیکھیے دوستی کا پودا کب پھل دیتا ہے اس وقت ہم جا کر بیج بوئے آتے ہیں۔

مکتوب، بنام

نواب مرزا علاؤالدین خاں علائی نسیم

سنو!

عالم دو ہیں۔ ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم"[1] اور پھر جواب دیتا ہے "للّٰہ الواحد القہار"[2] ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔ ۱۲ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتکڑیوں سے زخمدار مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی طاقت یک قلم زائل ہو گئی بے حیا ہوں سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دو ہتکڑیوں کے بھاگا میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا کچھ دن کم دو مہینے وہاں

---

[1] آج کے دن ملک کس کے قبضے میں ہے

[2] خداوند واحد و قہار کے قبضے میں ہے۔

رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا اب عہد کیا ہے کہ نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو، ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا شعر ؎

[1] فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازیں وادیٔ ویراں بروم

(عود ہندی صفحات ۱۰۰ / ۱۰۱)

---

[1] وہ دن بڑا مبارک ہوگا کہ جیل خانہ سے میں چلا جاؤں۔ اور ویران جنگل سے اپنے مسکن کی جانب پلٹوں۔

آج بدھ کے دن ۲۷ رمضان کو پہر دن چڑھے جس وقت کہ میں کھانا کھا کر باہر آیا ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط اور شہاب الدین خاں کا خط (معاً لایا) مضمون دونوں کا ایک ہے۔ واہ کیا مضمون ان دونوں ہیں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی تاریخ کہی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔ میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں، لوگوں کے "مادے" دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو "مادہ" اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مادہ " دریغ دیوانہ " پھر اس میں سے " آہ ہے " کے عدد گھٹائے تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈھا تمہارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھا دوں بارے ایک قطعہ درست ہوا اگر تمہاری زبان سے یعنی گویا تم نے کہا ہے پانچ شعر ہیں تین شعر زائد و موضوع ہوا، میں نہیں جانتا کہ تعمیہ اچھا ہے یا برا ہے۔ ہاں اخلاق تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو

قطعہ

گریہ اگر دعویٔ ہم چشمی ما کرد   بینی کہ شود ابر بہاری خجل از ما
ناچار بگرییم شب و روز کہ ایں سیل   باشد کہ برد کالبدِ آب و گل از ما

گفتی نہ نگہدارد دل از کشمکش غم   خود گرد بر آورد غم جاں گسل از ما
یحییٰ شد و از شعلۂ سوز غم ہجرش   چوں شمع دو دو دو دل ببر متصل از ما
غم دیدہ "نسیمیؔ" پے تاریخ وفاتش   بنوشت کہ در داغ پسر سوخت دل از ما

ما کے عدد ۴۱ دل کے عدد ۳۴ ما میں سے دل گیا گو ۴۱ میں سے ۳۴ گئے، باقی رہے ۷ وہ "داغ پسر" پر بڑھائے ۱۲۷۴ ہاتھ آئے۔

۱۲۷۴ھ م ۱۸۵۸ء

(خطوطِ غالب صفحات ۳۶۸/۳۶۹)

مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔

آنکھ کی گہاجنی جب پک کر پھوٹ گئی تھی اور پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بطریق خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اوس نے نشتر تجویز کیا تو خواہی نخواہی امتثال امر کرنا پڑا اور یوں شاید کچھ مادہ باقی ہو بہر حال حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشے۔ قطعہ

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۸ء

(خطوط غالب صفحہ ۳۶۹)

خاک نمناکم و تو بادِ بہار   نہ توانی مرا رحبا بردن

ہاں "نسیمی" زمن چہ می خواہی   زحمتِ خویشتن چہ می خواہی

خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک باد۔ اور میں نے تمھیں تہنیت دی تو مناسب۔ للہ الحمد للہ الشکر۔ بھائی سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ اٹھ نہیں سکتا ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمھارے والد ماجد سے اور تمھاری جدہ ماجدہ اور تمھارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمھاری قدم کے ہیں۔ مجھ سے لے لو اب میں اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا میرا مقصد سیاحت کا ہے پنشن اگر کھل جائیگا وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا جہاں جی لگا وہاں رہ گیا جہاں سے دل اکھڑا اچل دیا

تا زمیانہ خواستہ کردگار چیست

(خطوط غالب صفحات ۳۶۹/۳۷۰)

میری جان علائی ہمہ دان!

اس دفعہ دخل مقدر کا کیا کہنا "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اوس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے ساتیر مجھ سے مانگی اوس صحیفۂ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہوگے کہ اگر ساتیر نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے۔ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے اگر اوس فرہنگ کی نقل بھیجوگے تو مجھ پر احسان کروگے دساتیر میرے پاس ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اوس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب اگر دساتیر ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا۔ دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسال اہدا پر حصول اجر کیوں مترتب ہوگیا بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اوس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اوس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ ایک شعر حافظؔ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ:۔

غالبؔ دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

حافظ جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند

مولانا مذہب عاشق ز ند صہبا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

(۱۸۶۱ء)

(اقتباس خطوطِ غالب صفحہ ۳۷۷)

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ وہ فارسی غزلیں، دو اردو غزلیں اپنے حافظے کی تحویل میں سے بھیجتا ہوں۔ بھائی صاحب کی نذر۔

از جسم بہ جاں نقاب تا کے — ایں گنج دریں خراب تا کے
ایں گوہر پر فروغ یارب — آلودۂ خاک و آب تا کے
ایں راہرو مسالک قدس — واماندۂ خورد و خواب تا کے
بیتابی برق جز دمے نیست — ما را ایں ہمہ اضطراب تا کے
جاں در طلب نجات تا چند — دل در تعب عتاب تا کے
پرسش ز تو بے حساب باید — غم ہائے مرا حساب تا کے

لہ غالب بہ چنیں کشاکش اند
یا حضرت بو تراب تا کے

دوش کز گردش بختم گلہ بر روئے تو بود — چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب — نفسم پردہ کشائے اثر خوئے تو بود
چہ عجب صانع اگر نقش دہانت گم کرد — کہ خود از حیرتیان رخ نیکوئے تو بود
بکف باد مبادا ایں ہمہ رسوائی دل — کاخر از بردگیان شکن موئے تو بود
مُردن و جاں بہ تمنائے شہادت دادن — ہم ز اندیشۂ آزردن بازوئے تو بود

لہ کلیات فارسی میں یہ غزل نہیں ہے۔

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند — کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروئے تو بود

لہ لالہ وگل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تاچہا در دل غالبؔ ہوس روئے تو بود

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور
یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل انکو جو نہ دے مجھکو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھینگے — لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے — جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں" اور

۲ہ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اوس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن ہے — مدت ہوئی ہے دعوت آب و ہوا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور ہم سنا کیے

جون سنہ ۱۸۶۱ء — (اقتباس خطوطِ غالب صفحات ۲۷۴ - ۲۷۶)

لہ کلیات میں اس غزل کے بارہ اشعار شامل ہیں ۔

۲ہ دیوان میں اس غزل کے گیارہ اشعار ہیں اور ترتیب باندازِ دگر ہے ۔

مرزا علائی

پہلے استاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ۔ تاکہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا جھگڑا ان کی طرف سے ہو تم اوس کو یوں چکاؤ یعنی اگر اون کو حرف آشنائی اور ملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں شفیق ہیں۔ میرا سلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں مگر عمر میں چھوٹے۔ میری دعا قبول فرمائیں۔ صاحبین کی رائے کا اختلاف مشہور ہے۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر ہر ایک قول جدا جدا لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی۔ دو چار دن کے بعد لکھوں گا۔ تم تو سمجھ گئے ہو گے کہ وہ "صاحبین" مرزا قربان علی بیگ اور مرزا اشرشاد علی بیگ ہیں۔ بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھے منظور ہے اور یہ غزل معروض ہے۔ میری طرف سے سلام کہو ۔

از من غزلے گیرد بہ فرمائے کہ مطرب
در نے دمد از دولے نو ازش دو سہ دم را

غزل

جز دفع غم زیادہ نبود دست کام ما[1]   گوئی چراغ روز سیاہیست جام ما

---

[1] یہ غزل کلیات میں نہیں ہے۔

در خلوتش گذر بنود باد را مگر
صرصر بخاک راه رساند پیام ما

اے باد صبح عطرے ازاں پیرہن بیار
تسکیں ز بوئے گل نہ پذیرد مشام ما

ہر بار دانہ بہر بجا افگنم د مور
آید بدام ودانہ رباید ز دام ما

گفتی چو حال دل شنود مہرباں شود
مشکل کہ پیش دوست تواں بردنام ما

از ما بما پیام وہم از ما بما سلام
رنجد دے مباد پیام سلام ما

مقصود ما ز دہر بہر آیینہ نیستست
یارب کہ ہیچ دوست مبادا بکام ما

غالبؔ بقول حضرت حافظؔ ز فیض عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(خطوط غالب صفحات ۳۸۰/۳۸۱)

صاحب!

میرا برادر عالی قدر اور تمہارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روئے عقل اعادۂ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم۔ اس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے میری طرف سے جواب وہی ہوگا جو آگے لکھ چکا ہوں۔ یعنی میں تماشائی محض رہونگا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے ذکر کرینگے تو تو بھلی کہونگا آپ کے عم عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزارہا خیالات دکھلائی دیتے ہیں۔ یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ جس طرح میں مبتلائے وساوس و اوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخارات مراقی میں گرفتار ہونگے۔ قیاس مع الفارق ہے۔ نہ تخیل صادق۔ یہاں لا موجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و ظلمت کو ٹلائے ہوئے بیٹھے ہیں ؎

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر سوی اللہ و اللہ مافی الوجود

ضمیران بروزن درگراں لغت عربی ہے۔ نہ معرب بلیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پھول ہندستان میں ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کی تحقیقات از روئے "الفاظ الادویہ" ممکن ہے۔

آج اوس نے جلاب لیا۔ دس دست آئے۔ مواد خوب اخراج ہوا۔ فارسی غیر فصیح۔ امروز فلانی مسہل گرفت، دہ دست آمدند۔ مواد خوب برآمد۔ فارسی فصیح۔ امروز فلانی پگاہ دار دے مسہل آشامید۔ تا شام دہ بار نشست یا دہ بار بہ متبراح

رفت یادہ بار بہ بیت الخلا رفت۔ مادہ فاسد چنانکہ باید اخراج یافت۔

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہل خاص کے روز مرے میں عموماً "نشستن" استعارہ ہے "ریدن" کا چنانچہ ایک تذکرے میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعراء کی دعوت اپنے باغ میں کی۔ مرزا صائب اور اوس عصر کے کئی شعراء جمع ہوئے ایک شاعر کہ تذکرے میں اوس کا نام مندرج ہے اور بھول گیا ہوں۔ اکول تھا، مگر معدہ اس کا ضعیف تھا۔ حرص و شر کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا ہضم نہ کر سکتا تھا۔ کھانا کھا کر، شراب پی کر دروازہ باغ کا مقفل کر کے سب سو رہے ہیں۔ اس مرد اکول فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا۔ بلکہ کبھی اوس کیاری میں کبھی اوس روش پر، کبھی اوس درخت کے تلے کبھی اوس دیوار کی جڑ میں۔ قصہ مختصر، غایت شرم و حیا سے دو چار گھڑی رات رہے کود کر چلا گیا۔ صبح کو جب سب جاگے اوس کو ادھر ادھر ڈھونڈھا۔ کہیں نہ پایا۔ حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا۔ مرزا صائب نے ہنس کر فرمایا۔ یاراں! شمارا چہ افتادہ کہ میگوئید فلانی در باغ نیست۔ می بینم کہ مخدوم ہمدریں باغ چند جا نشستہ است۔

صبح جمعہ ۵ رمضان و ۷ مارچ سال استاخیز

رباعی خط میں لکھنا بھول گیا۔ یہ میں نے بھائی کو تہنیت میں بھیجی تھی۔

اے کردہ بہ مہر زر فشانی تعلیم　　　پیدا ز کلاہ تو شکوہ دیہیم
بادہ بتو فرخندہ زیزدان کریم　　　پروانگی جدید اقطاع قدیم

سنہ ۱۲۷۸ھ م سنہ ۱۸۶۲ء

(خطوط غالب صفحات ۲۸۵/۲۸۶)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی

خدا کی دہائی، نہ میں ہوں گا جیسا کہ نیرؔ سمجھا ہے اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو، یعنی خفقانی اور خیال تراش۔ نہ ویسا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خان بہادر سمجھے ہوں گے۔

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

کل استاد میر جان صاحب نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا۔ میں نے اون کو جانے نہ جانے میں متردد پایا۔ جائیں نہ جائیں میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسین خان اگر کسی وقت آ جائینگے تو اون کو تحریر کا خلاصہ خاطر نشان کرونگا۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلی کی دلبستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور نیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اوتر کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ ہاہاہا۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(اقتباس خطوط غالب ۳۸۶/۳۸۷)

جانِ غالب

دو خط متواتر تمہارے پہنچے مغربی عرفا میں سے ہے۔ بیشتر آدمی کے کلام میں مضامین حقیقت آگین ہیں لیکن "داماں گلہ دارد" و "گریباں گلہ دارد" اس میں میں نے اوس کی غزل نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ؎

[1] در بزمِ وصال تو بہ ہنگامِ تماشہ
نظارہ ز جنبیدنِ مژگان گلہ دارد

ایک شعر مجھے اوس کا یاد ہے۔

بھائی باپ تمہارا بدگمان ہے یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا پڑھ سناؤ ؎

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ و لے بد تر از گمان تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے۔ وہ ستمگر شعر و سخن کا طالب ہے زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا۔ مجھ پر یہ تکلیف اٹھوالو اور تم اس زمین میں چند شعر

---

[1] اس زمین میں قدسی کی کوئی غزل نہیں ہے۔

لکھ کر بھیجدو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر، واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں رہے۔ آگے جو کچھ حافظہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا اب جو کچھ یاد آگیا وہ لکھتا ہوں ؎

؎ با من کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست
در امر خاص حجت دستور عام چیست
مستم ز خون دل کہ دو چشمم از آں پر است
گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست
باد دست ہر کہ بادہ بہ خلوت خورد مدام
داند کہ حوض کوثر و دار السلام چیست
باختہ غمیم ز بود ی دوائے ما
باختگاں حدیث حلال و حرام چیست
از کاسہ کرام نصیب است خاک را
تا از فلک نصیبہ کاس کرام چیست
غالبؔ اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

(اردوئے معلیٰ $\frac{200}{201}$)

؎ کلیات فارسی ۴۰۴ پر یہ غزل دس اشعار پر مشتمل ہے۔

لو صاحب!

پرسوں تمھارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔

در بزم وصالِ تو بہ ہنگام تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصہ میں آگئی ہے۔ میں اس میں تخم ریزی کیوں کروں؟ اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں ؎

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بیجاست برادر اگر از من گلہ دارد

التوائے شرب شراب ۲۲ر جون۔ شروع شراب ۱۰ر جولائی۔
المنۃ للہ کہ در میکدہ باز است

۱۰ر جولائی (اقتباس خط ۳۴، اردوئے معلیٰ)

صفحات ۴۰۳/۴۴

صبح یکشنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

میری جان!

پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خان مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ ہے:

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانوں پھول گئے
کہا جو اوس نے ذرا میرے پانو داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ اور مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اوس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل اون اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اوس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔ جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو؟ مقطع بیشک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں ؎

شعر

ے دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسی کے ہیں ۔

(اقتباس خط ۴۶۰)

(اردوئے معلیٰ صفحات ۴۲۳/۴۲۴)

ے یہاں بھی غالب کو اسی پر اصرار ہے کہ یہ اشعار قدسی کے ہیں درآنحالیکہ یہ حیرتی کی یہ مشہور غزل کے اشعار ہیں ۔

میری جان!

ہر چند تمھارا ایک کلمہ ایک بزلہ ہے لیکن اس "خسر" و خسروانی" نے مار ڈالا کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے۔ کہاں "خسر" "خسران" لغات عربی الاصل اور کہاں روزمرہ مشہور کہ "خسر" سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتیاق و طباق کو تحسین سینہ زوری سے برتا ہے۔ اچھا میرا میاں یہ "خسر" بمعنی پدر زن کیا لفظ ہے؟ حروف بین الفارسی و العربی مشترک ہیں۔ لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے نہ عربی ہے۔ فارسی میں "پدر زن" یہ فک اضافت کہتے ہیں۔ عربی جس طرح نقصان لغت منصرف ہے۔ شاید "سسرے" کا اسم جامد بھی ہو یا فی الحقیقت "سسرے" کی تغریس و تعریب ہو۔ یہ پرستش نہ بسبیل استہزا ہے بلکہ بطریق استفسار و استعلام جو تمھیں معلوم بلکہ اگر تم مجہول ہو تو معلوم کر کے مجھے لکھ بھیجو۔

غالب

(اقتباس از خطوطِ غالب صفحات ۳۹۹/۴۰۰)

صاحب!

میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔ آج تمھارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ "خسر" کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی؟ میرا علم لغاتِ عربیہ کا محیط نہیں ہے اور یہ بطریق حق الیقین جانتا ہوں کہ "خسر" لغت فارسی نہیں "سسرے" کی تفریس سے خسر پیدا ہوا ہو تو کیا عجب ہے۔ تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو۔ وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں۔ لغت ہندی ہے۔ مفرس اور یہی تھا میرا عقیدہ

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اب اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں۔

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خان مغفور کا کیا مصرع ہے۔

آہ، جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

زائد بے فائدہ مرگ کا طالب غالب

جمعہ ۳/ جولائی ۱۸۶۳ء (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۶)

دوشنبہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ

اے میری جان۔

مثنوی ابرِ گہر بار کون سی نئی تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ معہٰذا شہاب الدین خاں نے بھیجدی۔ میں مکرر کیا بھیجتا؟

تیرۂ محرق کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافی طبع تحریر کو بہ سبب انزجار نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتب مبسوطہ کہاں سے موجود ہوتیں؟ "افسوس" کو میں نے عربی جانا۔ عربی نہیں ہے۔ اب مانا۔ یہ ایک سہو طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو غلط بحث پر ہے۔ "افسوس" و "فسوس" ایک کیوں ہو جائے؟

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجود قرب مخفی اور تم پر باایں ہمہ بُعد آشکار۔ دوران باخبر در حضور و نزدیکاں بے خبر دور۔ روپیہ آ گیا۔ دل سے نکلا۔ مخرج سے نکلا۔ ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائیگی اور یہ گُند کٹ جائے گا تب ترساں ترساں پیش گاہ نادری میں تمھارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں مردود بھی ہوں۔ والسلام

صبحدم با ابو البشر گفتم | بادۂ زر بدہ کہ زر داری
حیف باشد کہ از چو من پیرے | خاک زنگیں چو برتر داری
گفت، حیف است از تو خواہشِ زر | کہ تو گنجینہ ، گہر داری"

گنجدانِ سخن حوالۂ تست — خود بہ بیں تا چہ اے پسر داری
پیشِ من زر کجاست جانِ پدر؟ — ببری ہر چہ در نظر داری
گفتم اینک بہ بند پیمانے — زر بہ من می دہی اگر داری
سرِ زنبیل آن عمر عیار — گر ز عیاریش خبر داری
بکشا زود و زر بریز و بگوئے — کہ ہمیں مدّعا مگر داری
گفت "بابا فسانۂ بودہ ست — چہ فریبم دچہ بر داری

(اردوئے معلیٰ صفحات ۴۱۰/۴۱۱)

یکشنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
قدسیاں بحر دعای تو دو الا پدرت
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

میاں! تم جانتے ہو کہ میں عازم رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بہ شرط جمعیت کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیریت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ نیر اکثر ھا ز اندیشہ ایک بار میں صاحب کمشنر کی عیادت کو گیا تھا فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا۔ مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی صاحب کو میرا سلام کہنا

راقم غالب علی شاہ

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۸۱)

صاحب۔ تمھارا خط پہنچا مطالب دلنشین ہوئے غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں کیا اچھی رباعی ہے کسی کی:

مومن بخیال خویش مستم داند
کافر بگمان خدا پرستم داند
مُردم ز غلط فہمی مردم، مردم
اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم داند

بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر خبردار میرا سلام اخوین کو اور ان کو سلام مجھ کو پہونچا دیتا ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں[۵]

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مقطع اور مطلع مندرجہ دیوان ہے، مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسب حال نظر آئے اس واسطے لکھ دیے۔ تم نے اشعار جدید مانگے خاطر تمھاری عزیز ایک مطلع صرف دو مصرعے آگے کہے ہوئے یاد آگئے وہ داخل دیوان بھی نہیں ان پر فکر کرکے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں بھائی کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھ بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں۔

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے — غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے — مطلع ثانی۔ تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے — کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود — کسے خبر کہ وہاں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا — خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ دادودید گراں مایہ شرط ہے ہمدم — وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

لو صاحب۔ تمھارا فرمانِ قضا توامان بجا لایا۔ مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے اگر با احتیاط رکھوگے اور اردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھا دوگے تو اچھا کروگے۔ عمر و دولت روز افزوں باد۔ فقط

جمعہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء بارہ پر دو بجے تین کا عمل

(اردوئے معلی صفحات ۳۷۹/۳۸۰)

مکتوب بنام

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

جناب بھائی صاحب قبلہ

یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنی دارالریاست میں پہنچ گئے ہوں گے اور جمعیت خاطر روز افزوں رکھتے ہوں سوا یاران کے اور خیال مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو۔ خدا کرے تم کو یاد آجائے کہ مفتی جی شگفتگی کو شگفت کا مزید علیہ مسلم نہیں جانتے تھے۔ سکندر نامے میں دیکھا۔ بیت

بسے در شگفتی نمودن طواف
عنان سخن را کشد در گزاف

صہبائی شفق صبح کو غلط اور اس رنگ کو مخصوص بہ شام جانتا تھا۔ محمد سعید اشرف مازندرانی کے کلام میں نظر پڑا مصرعہ ہمچو صبح شفق آلودہ رخش سرخ و سفید الخ اب جو فقیر کا یہ مشہور مطلع ہوا۔

از جسم بہ جان نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

حضرت اکو اس میں تامل ہے خرابہ کی جگہ خراب کو نہیں مانتے۔ آیا یہ نہیں جانتے کہ لغت عربی اصل خراب اور خرابہ مزید علیہ۔ ویران بہ لغت فارسی اصل اور ویرانہ مزید علیہ موج لغت عربی اصل اور موجہ مزید علیہ ہے۔ مزید علیہ جائز اور لغت اصلی ناجائز کیوں ہو۔ ایک مصرع قدما میں سے کسی کا ہے، مگر پیش

مصرعہ مجھے یاد نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کا ہے ع

چوں مہر در کسوف نشم دچوں گنج در خراب

میں خود کہتا ہوں کہ اس کو نہ مانو اس راہ سے کہ میں قائل کا نام نہیں بتا سکتا۔ یہ مطلع مرزا محمد علی صائب علیہ الرحمہ کا ہے اور اوس کے دیوان میں موجود ہے ع

بہ فکر دل نفتادی ہیچ باب دریغ

بگنج راہ نہ بردی دریں خراب دریغ

گنج در خراب، گنج در خرابہ، گنج در ویراں، گنج در ویرانہ مستعمل اہل ایران ہے اس بات میں متردد ہونا محض عدم اعتنا ہے۔ والسلام۔ صبح سہ شنبہ دہم ماہ صیام سال غافر پے اہل اسلام۔

(عود ہندی صفحات ۱۸۸/۱۸۹)

مکتوب بنام

مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ

میاں۔ کل زین العابدین فوق کا خط مع اشعار کے ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بہ سبیل ڈاک بھجوادیا ہے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا دوپہر کو میں نے جواب لکھا۔ تیسرے پہر کو روانہ کیا۔ موتیوں کا پھنکا البتہ بہت مناسب ہے خیر موتیوں کا نوالہ بھی سہی۔ حافظؔ کے شعر کی حقیقت جب سمجھوگے جب قواعد مقررۂ اہل سخن دریافت کر لوگے قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اشعار میں قصیدے کی احتیاج آپڑے اور اوس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے جیساکہ استاد کا قطعہ ہے۔ اس میں ریو، عزیو، کا لیو، قافیہ ہے اور شعر آخر قطعہ کا یہ ہے۔ شعر غلط کردم دریں معنی کہ گفتم

زنخدان نگار خویش را سیو

حالانکہ صحیح سیب ہے بیائے موحدہ۔ شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کیا جو سیو لکھا۔ اسی طرح حافظؔ فرماتا ہے۔ مصرعہ

بہ بیں تفاوت وہ از کجاست تابہ کجا

یعنی حافظؔ فرماتا ہے کہ میں عاشق زار و دیوانہ ہوں صلاح کار سے مجھ کو کیا کام۔ پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مونث بولے تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا خود سانس کو مونث نہ کہوں گا۔ سیف کو عدو کش، اور کمند کو عدو بند۔

سیف عدو بند نہیں ہو سکتی تم کو کہتا ہوں کہ تم تلوار کو عدو بند نہ کہو کوئی اور اگر کہے تو اس سے نہ لڑو زلف کو شب رنگ اور شبگوں کہتے ہیں۔ شبیگر زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شبیگر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر چھ گھڑی رات رہے چل دیں نالۂ شبگیر آہ و زاری آخر شب کو کہتے ہیں زلف شبگیر نہ مسموع نہ معقول سخن کا قافیہ بن بھی درست ہے اور تن بھی جائز ہے یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے اور اس پر متقدمین اور متاخرین اور اہل ایران اور اہل ہند کو اتفاق ہے۔ قبۂ خشخاش پوست کے دوڈے کو کہتے ہیں اس میں کچھ تامل نہ چاہئے۔ تم اپنی تکمیل کی فکر میں رہا کرو زنہار کسی اعتراض نہ کیا کرو۔ والدعا۔

عودِ ہندی صفحات ۹۵/۹۷

سعادت واقبال نشان مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشیں ہو کہ تذکیر وتانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ اے لو" لفظ" اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔خیر، جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ایک گروہ نے کچھ مان لیا ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔الف مذکر۔ب۔ت۔ث مونث،جیم مذکر ح۔خ مونث دال ذال مونث رے، زے مونث سین شین مذکر ص ض۔ ط۔ظ مونث، عین غین مذکر، ف مونث، قاف کاف لام میم نون مذکر واد ہے یے مونث ہمزہ مذکر لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا مثلاً الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے۔

"خنزادہ" "خداوندزادہ" کا مخفف ہے لیکن فارسی نہیں۔عربی نہیں اردو کا روزمرہ تھا۔خنزادہ اور خنزادی مرادف "صاحبزادہ" اور "صاحبزادی" ہے فی زمانتا متروک ہے۔

"فق" فارسی لغت نہیں ہو سکتا عربی بھی نہیں ہے روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن لکھتا ہے۔

"کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق"

شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

"تکیہ" لفظ عربی الاصل ہے۔ فارسی و اردو میں مستعمل دونوں زبانوں میں ہم بہ معنی "بالش" اور ہم بہ معنی "مکانِ فقیر" آتا ہے۔ ایران میں "تکیہ مرزا صاحب" مشہور ہے۔ گل تکیہ لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے "گل" مخفف "گال" کا اور تکیہ بہ معنی "بالش" وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں۔ "گل تکیہ" کہلاتا ہے "گل" بہ معنی پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے ہنگامے میں سو برس سے اور دلی اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ "گل تکیہ" وضع کیا ہوا نور جہاں بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ "گل" کیا چیز ہے؟

"معنی مفرد بہ تلفظ جمع" اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ معنی "مفرد" معانی جمع اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے کیا معنی ہیں" یا "اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں" اس میں دخل نہیں کیا جاتا خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے "معانی" کی جگہ "معنے" بولتے ہیں۔

"رَت" لفظ ہندالاصل "رتھ" ہے بہ ہائے مضمرہ۔ بعض مذکر بولتے ہیں۔ بعض مونث۔ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار۔

(۱۸۵۶ء) راقم غالب

(خطوطِ غالب صفحات ۲۳۳-۲۳۴)

میاں،

کل زین العابدین فوقؔ کا خط، مع اشعار کے ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بہ سبیل ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں نے جواب لکھا۔ تیسرے پہر کو روانہ کیا "موتیوں کا جھمکا" البتہ موتیوں کا نوالہ بھی سہی۔

حافظؔ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے کہ قواعدِ مقررہ اہلِ سخن دریافت کرلو گے قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اشعار میں قافیے احتیاج آپڑے اور اوس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے جیسا کہ استاد کا قطعہ ہے اوس میں "دیو" و "غریو" و "کالیو" قافیہ ہے اور شعر آخیر قطعے کا یہ ہے۔

غلط کردم دریں معنی کہ گفتم

زنخندانِ نگارِ خویش را "سیو"

حالانکہ صحیح "سیب" ہے بہ بائے موحدہ، شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کیا جو سیو لکھا اسی طرح حافظؔ فرماتا ہے

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

حاصل اس کا یہ کہ دیکھ کتنا "تفاوت ہے" ایک حرفِ روی ساکن اور ایک جگہ متحرک۔ مگر یہاں ابھی معترض کو گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے "ہاں۔ تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں" سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں رکھا؟ اس کا

جواب پہلا مصرع ہے۔

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا

یعنی حافظ فرماتا ہے کہ میں عاشق زار و دیوانہ ہوں صلاح کار سے مجھ کو کیا کام؟ پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ "سانس" میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مونث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا خود سانس کو مونث نہ کہوں گا "سیف" کو "عدو کش" کہو اور "کمند" کو "عدو بند" سیف عدو بند نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم تلوار کو عدو بند نہ کہو کوئی اور اگر کہے تو اوس سے نہ لڑو۔ "زلف" کو "سب رنگ" اور "سب کوں" کہتے ہیں۔ "شب گیر" زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شب گیر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر چھ گھڑی رات رہے چل دیں "نالۂ شب گیر" آہ و زاری آخر شب کو کہتے ہیں "زلف شب گیر" نہ مسموع نہ معقول۔

"سخن" کا قافیہ "بن" بھی درست ہے اور "تن" بھی جائز ہے۔ یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے اور اس پر متقدمین اور متاخرین اور اہل ایران اور اہل ہند کو اتفاق ہے۔

"قبۂ خشخاش" پوست کے ڈوڈے کو کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تامل نہ چاہئے۔ تم اپنی تکمیل کی فکر میں رہا کرو زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔ والدعا[۵]

(خطوطِ غالب صفحات ۲۳۴/۲۳۵)

---

[۵] عود ہندی صفحات ۹۵/۹۷ سے یہی خط گزشتہ صفحات میں شامل ہے جس میں بعض جگہ لفظی فرق ملتا ہے۔

مکتوب بنام

ابوالقاسم خاںؔ

نوٹ:

غالب کا جس دور سے تعلق تھا اس میں ہر ذی علم سے توقع کی جاتی تھی کہ اسے ہیئت، فلسفہ، تصوف، فن شعر و سخن، طب و دیگر رائج الوقت علوم سے کم و بیش لگاؤ یا واقفیت ضرور ہو۔ بر این بنا، غالب نے بھی زمانہ کے رواج کے مطابق منجملہ متذکرہ علوم علم طب کا بھی مطالعہ کیا ہوگا لیکن اسے حسن اتفاق کہیے کہ ان کا حلقہ احباب میں شاہی اطبا بھی شامل تھے۔ مرزا صاحب خود بھی دائم المریض تھے اس لیے مختلف امراض اور ان کے علاج معالجہ کی تدابیر اور ادویہ پر تبادلہ خیالات ہوتے رہتے ہوں گے اس طرح ایک طرف تو ان کو نامی گرامی اطبا کی صحبت سے فیض پہنچتا ہوگا دوسری طرف طب پر بعض اہم کتب کے مطالعہ کے مواقع ہاتھ آتے ہوں گے قاری کی واقفیت کے لیے ایک واقعہ دلچسپ یہ ہے کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گڑھی حیدر آباد) کے کتب خانہ کی ایک کتاب موسومہ بہ "ذخیرہ دولت شاہی" پر غالب کی مہر ثبت ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ کتاب ضرور ان کے مطالعہ میں رہی ہوگی۔ مرزا تفتہ کو ایک مکتوب میں منشی نبی بخش حقیر کے لیے ایک نسخہ تجویز کرتے ہوئے "طب محمد حسین خانی" کا حوالہ دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کا بھی انھوں نے بامعان مطالعہ کیا ہوگا۔ علم طب پر اس نوع کی دیگر معیاری کتب اغلب ہے کہ ان کے مطالعہ میں آئی ہوں گی۔

ایک بار نواب کلب علی خاں سابق فرمانروائے رام پور نے غالب کو اپنی ناسازیٔ طبع کا حال تحریر فرمایا انھوں نے عوارض کی تفصیل کے پیش نظر اپنی تشخیص کے مطابق نسخہ تجویز کیا جو ان کے مکتوب میں درج ہے۔ اسی طرح ہرگوپال تفتہ نے غالب کو منشی بخش حقیر کی علالت کا جو حال تحریر کیا تھا اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ ماء الجبن[1] سے آرام نہیں ہوا۔ غالب کا ذہن فوراً طب محمد حسین خانی کی جانب منتقل ہوا جس کے حوالہ سے نسخہ لکھ بھیجا۔[2]

ان تحریروں کے مطالعہ سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ غالب نے نہ صرف علم طب کی بہت سی کتب کا مطالعہ کیا تھا بلکہ انھیں بہت سے نسخے بھی زبانی یاد تھے اور ترکیب استعمال، پرہیز اور غذا کی مناسبت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مریض کو دیکھے بغیر عوارض کی تفصیلات کا علم ہو جانے کے بعد مرض کی تشخیص کر کے مناسب نسخہ تجویز کر سکتے تھے یہ اوصاف ایک طبیب حاذق ہی متسف ہو سکتے ہیں۔ یہ دیگر امر ہے کہ غالب نے نہ اسے اپنا پیشہ بنایا نہ طبابت ہی اختیار کی۔ یہاں ان مکتوبات کے تذکرے اختصار میں دیکر اکتفا کی گئی ہے گو اس ضمن میں کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ مگر چونکہ اس کتاب سے متعلق نہیں اس لیے غیر ضروری سمجھ کر ترک کیا جا رہا ہے۔

غالب کی تصنیفات میں علم طب سے آگہی کی سب سے پہلی شہادت مرزا ابو القاسم خاں کا پانچ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ درج ذیل ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے ابو القاسم خاں کو مسہل لینے کا مشورہ دیا اور نسخہ تجویز کیا جس سے انھیں بہت فائدہ ہوا اور تشکر کے طور پر انھوں نے قطعہ لکھ کر غالب کو ارسال کیا۔

---

[1] دودھ کو پھاڑ کر جو پانی برآمد ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ [2] نادرات غالب صفحات ۴۵/۴۹

(۱) اے مسیح زماں تو می دانی
به جنابت ارادتے که مراتست
بوعلی کے رسد به تشخیصت
که فلاطون مثال تو داناست

(۲) می سزد گر بگویمت بقراط
در فلاطون بخوانمت زیباست
مسہلے وادی و بغیر مودے
به عمل آئر بے گماں که شفاست

اس کے جواب میں غالب نے دو قطعے تحریر فرمائے۔

(۱) بوعلی و مسیح و افلاطون
ہر که گفتی بگو که از تو سزاست
بے ادب باشم از کنم تکذیب
جی فرو باشم از شمارم راست

(۲) نسبت من به بوعلی سینا
صاف ہم چوں سراب بادریاست
بوعلی گفتیم روا باشد
خر س در کوه بوعلی سیناست

(مرقع غالب، مرتبہ پرتھوی چند)

مکتوب بنام امراؤ سنگھ

نوٹ :

غالب طبعاً آزاد واقع ہوئے تھے ہر نوع کی تنگی و پابندی ان کے لیے بلائے جان تھی ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے باعث جو فرائض اور پابندیاں ان پر عائد ہوگئی تھیں انھیں وہ ایک شریف آدمی کی طرح پوری کرتے رہے لیکن اس سے وہ کبھی خوش نہیں رہے انھوں نے اپنے مکتوبات میں متعدد مقامات پر شادی کو حبس دوام سے زوجہ کو پھانسی کے پھندے طوق اور بیڑیوں سے اور حسین علی خاں و باقر علی خاں پسران نواب زین العابدین خاں عارف کو آہن کی دو ہتکڑیوں سے تعبیر کیا ہے۔ امراؤ سنگھ کی دوسری زوجہ کے انتقال کی خبر پاکر ایک ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو تحریر کیا ہے۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھکو رحم اور اپنے واسطے رشک آیا۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبارہ ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ تاہل کی زندگی سے تنفر کا اظہار اس طرح اور کیا ہے :۔

بھائی میرا ذکر سنو : ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے ایک کو تنہائی سے نفور ہے ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ کبھی

اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں میری سبکی اور ذلت تھی اگرچہ مجھکو دولت تنہائی میسر آجاتی۔ لیکن اس تنہائی پر چند روزہ تجریدِ مستعار کی کیا خوشی؟ خدا نے لا ولد رکھا تھا شکر بجالاتا تھا خدا نے میرا شکر منظور نہ کیا یہ بلا بھی قبیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتکڑیاں بھی پڑ گئیں۔

اے آں کہ براہ کعبہ روے داری دانم کہ گزیدہ روے داری
زیں گونہ کہ تند می خرام دانم در خانہ زنی خوے داری

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود از غصہ فراغتش ہمانا نبود
دار د بہ جہاں خانہ وزن نیست روا نازم بخدا چرا توانا نبود

گیرکہ در روز حشر چوں تو نبستی بر سرِ دوزخ نہندہ ترہ تہبتن
واں کہ نہ باشد دراں مضیق مصیبت در طلب نان و جامہ کشمکس از زن
واں کہ نباشد دراں مقام صعوبت شور تقاضائے نارِ وائے مہاجن

بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم گراں تر آمد از طوق عزازیل

(مرقع غالب، مرتبہ پرتھوی چند)

مکتوب بنام

مولوی عبدالغفور نسّاخ

جناب مولوی صاحب قبلہ۔ یہ درویش گوشہ نشین جو موسوم باسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے مکرمت حال کا شاکر اور آیندہ افزایش عنایت کا طالب ہے۔ دفتر بےمثال کو عطیہ کبریٰ سمجھ کر یاد آوری کا احسان مانا پہلے اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ حضرت نے اس ہیچمیرز ہیچمداں کو قابل خطاب و لائق عطائے کتاب جانا میں دروغ گو نہیں خوشامد میری خو نہیں دیوان فیض عنوان اسم بامسمیٰ ہے دفتر بےمثال اس کا نام بجا ہے الفاظ متین معانی بلند مضمون عمدہ بندش دلپسند ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بیباک و گستاخ ہیں شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے اب ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ نساخ ہیں۔ تم دانائے رموز اردو زبان ہو سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے نظم و نثر فارسی کا عاشق اور مائل ہوں ہندوستان میں رہتا ہوں، مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر نہ دنیا کی توقع نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید جیسا کہ خود ایک قصیدۂ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں

شعر

چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من [1]

زآیندہ ناامیدم و از رفتہ شرمسار

---

[1] میرے اعمال پر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب میں عمر گزشتہ سے شرمندہ اور آیندہ سے ناامید ہوں۔

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا اب کہاں تک رہوں گا ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا تین رسالہ، نثر کے یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے اب کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی ہرزہ گوئی ساری عمر گنوائی بقول طالب آملی علیہ الرحمۃ شعر؎

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی
دہن بر چہرہ زخمی بود و بہ شد

سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قابو میں وہ زور نہ رہا طبیعت میں وہ مزہ سر میں وہ شعور نہ رہا پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے اس سبب سے فنِ کلام میں گفتگو کر لیتا ہوں حواس کا بھی بقیہ اس قدر ہے کہ معرض گفتار میں مطابق سوال وجواب دیتا ہوں روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار بندہ کیونکر بخشا جاتا ہے۔ حضرت سے یہ التماس ہے کہ آپ جو اہد آ کے عادی اور مجھ کو ارسال نامہ کی سبیل کے عادی ہوئے ہیں جب تک میں جیتا رہوں نامۂ پیام سے شاد اور بعد مرنے کے دعائے مغفرت سے یاد فرماتے رہیے گا۔

والسلام بالوف الاحترام
(عود ہندی صفحات ۱۷۹/۱۸۰)

مکتوب بنام

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ دہلوی

تمھارے بھائی کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں ۔ کلیات اردو جو تم نے خریدے ہیں ایک اس میں سے چاہو اپنے بچا کے نذر کر دو چاہو بھائی کو تحفہ بھیجو اس وقت میں نے ان کے نام کا خط لوہارو روانہ کیا ہے بعد ارسال خط مولوی سدید الدین خاں صاحب میرے ہاں آئے اثنائے حرف و حکایت میں میں نے شاہین کی حقیقت پوچھی جواب دیا ہاں عربی میں ایک باجے کا نام شاہین ہے صورت اس کی پوچھی گئی کہا کہ مجھے معلوم نہیں ۔ صراح میں میں نے دیکھا ہے فقط تم جو مولانا علائی کو خط لکھو یہ رقعہ ملفوف کر دو ۔

غالب

(خطوط غالب صفحات ۳۴۰/۳۴۱)

رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب حرکت کی ہے یہ بیجا تم نے
حاجی کلّو کو دیکے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا ہے کلیجہ تم نے

رباعی

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

(خطوط غالب صفحہ ۳۴۲)

مکتوب بنام

مردان علی خاں رعنا

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام، نظم و نثر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم یکتا ہو، خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا جفا کیا ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں تھنی ایا اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں، ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مونث ہے۔ بے شبہ و شک، والسلام والاکرام

(عود ہندی صفحہ ۲۰۱)

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۷)

خاں صاحب مشفق خاں کو میرا سلام۔ تمھارا عنایت نامہ پہونچا رام پور کا لفافہ آج رامپور کو روانہ ہوا۔ کاغذ اشعار میں نے دیکھ لیا کہیں اصلاح کی حاجت نہ تھی۔ نالہ دراغ شعر رعنا گذرا ہے مرا نالہ ور چرخ کہن سے۔ تھا دوح کا ہمدم نہ پھرا جا کے وطن سے۔ نالہ دل بنا دیا۔ نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھتے ہیں فارسی غزل تم نے بے فائدہ لکھی، دیکھو صاحب تم نے اپنے مسکن کا پتا لکھا سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے مجھ سے ملے بہت خوبصورت اور خوش سیرت سعادت منداور معقول پسند آدمی ہیں تمھارے مدّاح اور میں ان کا ثنا خواں خدا تم کو اور ان کو سلامت رکھے۔

(عود ہندی صفحہ ۲۰۲)

مکتوب بنام

مرزا رحیم بیگ مصنف ساطع برہان

بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نوراللہ قبلہ بالاسرار وغلیہ بالانوار
سخنے چند گفتہ می شود بیت نہ بہ منطق پارسی و دری۔ ہمیں ہندی سادہ سرسری
جس طرح توحید میں نفی ماسوئے اللہ دستور ہے مجھ کو تحریر میں حذف زوائد
منظور ہے۔ عزم مقابلہ نہیں قصد مجادلہ نہیں سرتاسر دوستانہ حکایت ہے
خاتمہ میں ایک شکایت ہے شکوہ دردمندانہ منافی شیوہ ادب نہیں۔ معہذا
اظہار درد دل مراد ہے کوئی بات جواب طلب نہیں احسان مند ہوں آپ
کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا ان کے حسنِ ظن
کے مطابق مجھ کو معشوق میرے استاد کا نہ لکھا اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ بقول غالب
(یا کدام خرس درجوال شدہ ام) بہم کیے یا اور دو چار جگہ کلمہ توہین رقم کیے ہیں
میں نے اپنے لطفِ طبع اور حسن عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے
دلنشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس
یقین کیا یا خرس درجوال شدن عبارت ہے صحبت سے خواہی مدافعت کے
واسطے ہو خواہی محبت سے مجھ کو اس کا قرب بہ سبیل آدیزش ہے۔ تم کو اس کا قرب
از روئے آمیزش ہے دوسرے فقرے کے معنی یہ ٹھہرائے بلکہ بلا تکلف
میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کی مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت
باعثِ دردِ دل ہوئی شدت درد میں آدمی چیختا ہے چلاتا ہے۔ ہائے وائے

کرتا ہے غل مچاتا ہے جیسا کہ سعدی بوستاں کی اس حکایت میں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔ مصرعہ شبے زیت فکرت ہمی سوختم۔ فرماتا ہے مصرع۔ کہ نا ساز فریاد خیز دز درد۔ جناب مرزا صاحب کیا تم نہیں جانتے، بے شبہ تم جانتے ہوگے کہ اکابر اُمت کو امور دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دیگر پہنچی ہے اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا یہاں تک کہ اس کی تحمیق بھی کی تو ادر عدیان علم وعقل اس مسکین کے جگر تشنہ خوں کیوں ہو جائیں اور جب تک نقشِ ہستی صفحۂ دہر سے نہ مٹائیں آرام نہ پائیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قاطع برہان میں لکھا ہے نہ اس کو سمجھتے ہیں اور نہ کچھ آپ لکھتے ہیں نہ اس کے معنی سمجھتے ہیں سوال دیگر جواب دیگر پر مدار ہے۔ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے۔ برہان قاطع والے کی محبت سے دل بیقرار ہے فرطِ غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔ منشی سعادت علی نہ ناظم ہے نہ نثار ہے بموجب اس مصرعہ کے مصرعہ مقتضائے طبیعتش ایں مست، ناچار تم کو معرض تحریر میں تحمل اور تامل چاہیئے۔ سخن پروری و جانب داری میں تو غل چاہیئے مجسب اختلاف طبع مانو نہ مانو مگر یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔ اگرچہ قاطع برہان میں جا بہ جا لکھتا آیا ہوں۔ مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گذرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں جس نے چاہا ہے۔ اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے فارسی کی جو فرہنگیں حضرت نے لکھی ہیں۔ مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے۔ آخر مقاصد صرف و نحو عربی

بھی تو صرف مطالعہ کتب سے نہیں نکالے ہیں پہلے تعلیم تعلم ہے پھر کتب قواعد کے حوالے جابہ جا ہیں قواعد فارسی کا رسالہ اہلِ زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوش پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے شید لائے ہندی سیکر دی نے حاجی محمد جان جان قدسی علیہ الرحمتہ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلالائے طباطبائی علیہ الرحمتہ کو خط لکھا ہے سرآغاز خط کا ایک قطعہ جس میں صحرا و دریا قافیہ اور ہرساند ردیف شعر کا اخیر کا مصرع ثانی یاد رہ گیا ہے مصرع یعنی بہما دیو مقوی ہرساند۔ خلاصہ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان ہے زبان دان ہے یعنی مقلد اور کاسہ لیس اہلِ ایران ہے۔ حاجی محمد جان کے کلام کی سند پکڑ۔ تجھے کس نے کہا کہ اس سے لڑ گیا تو نے سُنا نہیں جو عرفی و فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے روبرو ہوئی ہے۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہوگیا ہوں اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی و انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف خاقانی و انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیرزانوں کا ہے۔ ہائے تمیز کہاں سے لاؤں جو دیکھے کہ یہ حال قلمرو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے قیاس الفارق کی بہار دیکھو مجرد تقدم زمانے کا اعتبار دیکھو مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں ان سے کمتر ہے صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے کیا عرفی کیا انوری کیا خاقانی ایک شیرازی ایک خاوری ایک شروانی اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندستان ہے میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد و پارسی زبان ہے[1] ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند۔ نابنالم

ہم ازاں جملہ زبانم دادند۔ زباں دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیۂ خاص منجانب اللہ ہے فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوشگوار اور معنی یاب ہیں۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویٰ زباں دانی کے باب میں رہے فرہنگ لکھنے والے خدا ان کے تریج سے نکالے اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے وہ بھی نہ کوئی ہم قدم نہ کوئی ہم راہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے اُستاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے نہ آپ شیرازی رہے اُستاد رمضانی رہے رگ گردن نہ تھی دعویٰ زبان دانی میرا یہ قول تو خاص ہے نہ عام ہے مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو میں کیا پیری ہے۔ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشائے برتری ہے تو بیچارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اُٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں تو بتو اور لباس در لباس وہم در وہم اور قیاس در قیاس پیاز کے چھلکے کی جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا مغز نہ پاؤ گے فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ گے لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو ورق ہی نظر آئیں گے معنی مفہوم ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دلنشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس یعنی لغات فارسی میں نہ سراسر غلط ہے البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے خصوصاً دکنی تو عجیب جانا نہ ہے لغو ہے پوچ ہے پاگل ہے دیوانہ ہے وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے

اصلی کیا ہے اور بائے زائدہ کیا ہے حیران ہوں کہ اس کی جانب داری میں کیا فائدہ ہے خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں مگر دکنی کے جانب داروں کا چور رنگ ہوں مجھے جو چاہو سو کہو اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو۔ کہیں جامع لطائف غیبی کو برا کہتے ہو کہیں نگارندہ دافع ہذیان سے جھگڑتے ہو جانتا ہوں کہ دکنی کی عبارت کی خامی اس کی رائے کی کجی اس کے قیاس کی غلطی اگر نہ سب جگہ بلکہ بعض جگہ سچ جانتے ہو مگر یہ میں نہیں جانتا کہ اتنی محنت کرنی اور اس کے رفع تخلیہ کے واسطے توجیہات باردہ ڈھونڈھنی کس واسطے ایسا اس کو کیا کہتے ہو مجھ پر جدا منھ آتے ہو مولوی نجف علی اور میاں دادخاں سے جدا بگڑتے ہو بھائی صاحب مغلچہ پن پر آگئے گو ہار لڑتے ہو سچ ہے غالب آگندہ گوش ہے کسی کی نہیں سنتا اسی سے آپ کے مقرر کئے ہوئے قاعدہ کے موافق کہتا ہوں کہ قاطع برہان و دافع ہذیان و لطائف غیبی کو ہرگز نہیں دیکھا آویزہ و افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں دادخاں شرمسار ہے۔ جو کچھ اس مصنّف نے اس باب میں لکھا وہ قول فیصل اور کافی ہے مانیں یا نہ مانیں ناظرین کو اختیار ہے گلہری بکاف فارسی مکسور بوزن اکہری لغت ہندی الاصل اس کی شرح میں جداگانہ ایک فصل کاف فارسی مکسور کی جگہ کاف عربی مفتوح اعراب کا بوزن تشتری وضوح مجھے اور میرے دوست سیف الحق کو دو سہو طبعی پر استغدار ہوا خواہان بوہرہ دکنی کو اغلاط متواتر کے جواز پر اصرار فاعتبروا یا اولی الابصار خبر دبے داد نور اور خورہ مع الواؤ بجھی جذام ایک دیزہ بجھی اور آویزہ بمعنے ناپاک ایک یہ اور ہزار ایسے اغلاط سند اور مقبول اور منظور گویا یہ مصرع جو حمد میں ہے بمصرعہ کند ہر چہ خواہد بر و حکم نیست۔ اس کی شان میں صادق سمجھ لیا ہے۔ چشم بد دور

اب چاہیے کہ اس کے پوچھنے والے اس کے نام کے بعد جل جلالہٗ لکھیں اور اگر اتنی جرأت نہ کریں تو نظر بافادہ و استفادہ عم نوالہٗ لکھیں۔ ستّر برس کی عمر کانوں سے بہرا جمعیت کم تفرقہ زیادہ اور پھر خودداری اور کسر نفس اور استغنا خداداد بیہودہ بکنے میں اوقات کیوں صرف کروں پاسخ نگاری کیوں لفظ بہ لفظ و حرف بحرف کروں آپ کو اپنی نمود اور شہرت منظور ہے خردہ گیری و عیب جوئی سے مجھ کو نفرت ہے اور حیا آتی ہے زیادہ گوئی سے۔ آپ کے حسن کلمات سے قطع نظر کر کے ناظرین مصنف کے وجدان پر چھوڑ دیتا ہوں اور شکایت موعودہ سے پہلے تین امر ضروری لکھ لیتا ہوں (صیحہ بمعنی آواز اسپ زینہار بنیت) اس کے صحیح ہونے میں کیا کلام ہے جو صیحہ سے آواز اسپ مراد رکھے وہ ناقص ہے اور خام ہے کیا عرفی کا شعر عرفی کے خط سے لکھا ہوا کسی کو نظر پڑا کہ ناظر سے سن کر تمھارا ذہن وقاد نقاد وہاں جا لڑا لغت کسی باطن کے اندھے کے ہاتھ سے لکھا جائے اور پھر عرفی جیسا شاعر دیدہ ور باز پرس میں پکڑا جائے تمہارا محبوب بوہرہ دکنی شین منقوطہ مع التحتانی کے بیان میں شیہہ کو گھوڑے کے ہنہنانے کی فارسی بتاتا ہے عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزن دلیل کہتے ہیں صیحہ بوزن بیعنہ عموماً بمعنی ہر صدا سے ہولناک و مہیب آتا ہے میں کیونکر فرہنگ نگاروں کے اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو بھی سمجھوں اور کیوں کر کاتبوں کے املا کو مصحف مجید کی طرح سر پر دھروں یہ تو جب ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو جماد اور نبات فرض کرلوں جرم و خطائے بلوغ بر گردن بندگان جناب است میں آپ کو مخاطب بالفتح ٹھہرا کر یہی فقرہ پڑھ کر چپ رہتا ہوں بعد اس کے تبدل جیم بہ تحتانی کو مسموع کہتا ہوں۔ یعقوب کو بتغیر لہجہ انگریزی زبان میں جاکوب کہتے ہیں کہاں مبدل منہ کہاں تغیّر لہجہ حضرت

آپ جو کہتے ہیں خوب کہتے ہیں خوب کہتے ہیں کودک کو ترجمۂ طفل نہیں مانتے اور پھر خاتمہ میں رسیدگان بصیفۂ جمع لکھواتے ہو واقعی یوں ہے کہ جو کچھ لکھواتے ہو بہ نیروے بصر نہیں بلکہ از روئے سمع لکھواتے ہو خط تمام ہوا اب مستغیث کی عرضی کی سماعت ہو لیکن سماعت از روئے انصاف بالائے طاعت ہو عرضی گذرانے سے پہلے مستغیث پوچھتا ہے کہ آپ کے محکمۂ عالیہ کا سررشتہ دار دیانتدار ہے یا نہیں سخن فہم ہوشیار ہے یا نہیں میں تو گمان کرتا ہوں کہ امین نہ ہو دلیل سن لیجئے اگر یقین نہ ہو (صیحہ بمعنے آواز اسپ زنہار نیست) اس کے ماقبل اور بھی عبارت ہے سنانے والے نے نہ پڑھی ہو کتنا بعید ہے کس واسطے گئے اس عبارت کے مفہوم کو ملحوظ نہ رکھنا اور محمد اکرم پنجابی کا شعر تو قابل التفات نہیں مگر مولانا جمال الدین عرفی شرازی رحمتہ اللہ علیہ کا شعر بہ تتبع کاتب غلط لکھوا دینا تم سے ایسا بعید ہے۔ انشا میں ناسخوں کی رائے کو مانتے ہو اور املا میں کاتبوں کی غلطی کے کیوں نہ قائل ہو انشا و املا و لفظ و معنی میں تقلید چھوڑ کر تحقیق کے کیوں نہ مائل ہو تقصیر معاف یہ نہ استناد بہ کلام عرفی عالی مراتب ہے بلکہ پیروی خامۂ کج رفتار کاتب ہے۔ کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرہ کا دماغ نہ ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے فراغ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی تو یہ اپنا شعر اردو میرے وردِ زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا۔ شعر رات دن گردش میں ہیں سات آسماں۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ اب جو اصلاح حال وحصول سے دل مایوس ہے تو طبیعت اسی غزل کی اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے شعر۔ عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ۔ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رزق کا ہے جب معاش مفروہو تو پھر غم کیا ہے۔ نہ صاحب یہ

باتیں جانوروں کی ہیں کہ کچھ کھا لیا پانی پی لیا اور چین سے سو رہے۔ آدمی عموماً اور صاحبان ننگ و ناموس خصوصاً باوجود فراغ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا ہیں کہ کوئی کیا کہے یہ حال تو یا صاحب واقعہ جانے یا خدا جانے دوسرے سے یہ کار افتادہ کیوں کہے اور بغیر کہے دوسرا کیا جانے۔ مناظرہ کا تو ہرگز ارادہ نہیں اگر مردہ دل نہ ہوتا تو باتیں کہتا زیادہ نہیں وہ بھی از روئے بحث و تکرار نہ باندازِ استفسار اظہار سے مقصود نفس اظہار۔ یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے کتنے محققین نے آپ کو اپنا امام مان لیا ہے جب تک نہ اجماع محققین کا ہوگا یہ خطاب باجماع اہل عقل ناجائز و ناروا ہوگا وہ فرماں روائے عہد شاہنشاہ کہلائے گا کہ بادشاہ جس کے فرماں پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا۔ یہ میر شہنشاہ صاحب کیوں کہ شاہ جہاں گیر ہو جائیں گے۔ اگر حضرت بفتحۂ قاف ثانی بصیغۂ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نرائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔ ساطع برہان کے تیرھویں صفحہ کی نویں سطر میں آپ لکھتے ہیں۔ (ہمچنیں بہ افراط و تفریط توضیح را کار بند شدہ اند کہ بداں حرف گیری تواند کرد) تواند توانستن کے مضارع کی بحث میں صیغۂ واحد غائب ہے فاعل چاہتا ہے خواہی معرفہ جیسے احمد محمود خواہی نکرہ جیسے یہاں کسے یا شخصے مردے بازنے اور اگر فاعل مذکور نہ ہو تو اس صورت میں تواں کرد چاہیے کہ تواں ما لم یسم فاعلہ ہے کرامت تو مجھے حاصل نہیں ہاں از روئے حسن عقیدت کہتا ہوں کہ یا آپ نے یوں لکھا ہے کہ (کسے بداں حروف گیری تواند کرد) یا تواند کی جگہ تواں رقم فرمایا ہے فی الحقیقت آپ نے بیل کے جوئے کا بوجھ میری گردن پر رکھ دیا اور میں نے ایک بیل کا بوجھ پشت مبارک سے اٹھا لیا اور اسد اللہ داد

خواہ جلد آ اور اپنی عرضی لا۔ حضرت آیا اور عرضی لایا۔ پہلے پانچ کاغذوں کی نقلیں علی الترتیب پڑھی جاویں پھر سررشتہ دار صاحب بہ کمال امانت و دیانت عرضی سُنا دیں۔ نقل عبارت برہان قاطع۔ آب دہ دست بکسر دال ابجد و ہائے ہوز اشارہ بہ حضرت رسول صلوات اللہ علیہ است خصوصاً و شخصے را نیز گویند کہ بزرگ مجلس بود آرایش صدور زینت ازو باشد عموماً۔ نقل عبارت قاطع برہان۔ از خامی عبارت چشم می پوشم و می خروشم کہ آب دہ دست مرکب از آب و دہ کہ صیغۂ امر است از دادن و دست کہ با وجود معانی دیگر مسند را نیز گویند معنی ترکیبی رونق دہندۂ مسند ہر آئینہ تا مسند را بطرف نبوت یا رسالت یا ہدایت مضاف نہ گردانند بہ مقام لغت فرو نیازند بلکہ در مدح اکابر و صدور نیز بے اضافہ لفظ امارت و شوکت و امثال اینہاں نگارند کہ تنہا آب دہ دست افادہ معنے شویانندۂ دست میکند و آں خود اہانتی ست قبیح بیچارہ در نظم و نثر لغت آب دہ دست رسالت دیدہ است و نعیمہ مضمون را لغت اندیشیدہ است نقل عبارت ساطع برہان۔ آب دہ دست خدا نہ کند کہ ایں اعتراض از جانب مرزائے من باشد کور سوادے ہچو من گفتہ باشد بہ خاطر داشت آں درج کتاب کرد ورنہ ایں کنایہ قابل اعتراض نیست چہ اب دہ دست جملۂ ترکیبی ست دست کہ در عربی و فارسی بمعنی مسند ست مضاف و مضاف الیہ کہ معنی محذوف باید دانست بلکہ کلامیست مستقل ترادف بالا دست مضاف و مضاف الیہ کہ معنی صدر و مسند بزرگ قوم باشد صاحب مؤید الفضلا در لغت فارسی ایں لغت را بسند دو کتاب کہ آداب و قنیہ باشد بہمیں صورت و صحت ہمیں معنی نگاشت و در مدار نیز و صاحب رشیدی آوردہ کہ آب دہ دست بمعنی بزرگ مجلس و معنی ترکیبی آں رونق صدر و مسند قولہ بیچارہ در نظم و نثر لغت آب دہ دست رسالت

دیدہ ونعیمہ مضمون را لفت اندیشیدہ است انتہی اقول جامع ایں کنایہ را در نظم ونثر وبے اضافۂ رسالت دیدہ است وہمچناں ازنن دہ برج کبوتر انش۔ تبصرہ پس گرداں جناب اگر فراموش نکنند در شرح کنایہ ماہی چشمۂ خضر در باب المیم چو بیند کہ میگوئید کہ آب دہ دست استعارا برائے آنحضرت از خاقانی از رکاکت نیست وائے بریں عقیدت کہ اورا بہ پیمبرے بر داشتند وباز بہ نسبت رکاکت سرنگوں انداختند۔ نقل عبارت برہان قاطع۔ ماہوچی شمہ خضر کنایہ از زبان ودہان معشوق ست، قاطع برہان۔ یارب ماہوچی شمہ خضر کدام لغت مست من در کتاب منطبعہ بدیں صورت دیدہ ام مصرعہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ در ضمیر میگذرد کہ ماہی چشمۂ خضر خواہد بود وآں خود مضمون نیست بطریق استعارہ بالکنایہ کہ سخنور لباخون جگر خوردہ باشند تا در نظم ونثر خویش آوردہ باشند پس ہر کہ ایں زا در گفتار خویش آرد سرقہ خواہد بود از لغات منتقلہ وکنایہائے مشہور نیست کہ بکار دیراں روزگار اید شیر خدا کہ ترجمۂ اسد اللہ است گوئی یکے از نامہائے جناب ولایت پناہ است صد ہزار کس در کلام خویش آوردہ باشد وسرقہ نیست۔ دکنی در بحث شین مع الیا شیر شرزہ غاب ام حضرت امیر علیہ السلام نوشتہ واں مضمون نیست کہ خاقانی در قصیدہ قسمیہ بہم رساندہ شیر شرزہ خود بیست عام کہ بر ہر مرد شجاع وسرہنگ جنگجو اطلاق تواں کرد وغاب بمعنی ہمیشہ نیستاں است ہر آئینہ ایں صفت نہ سزا وار شان اسد اللہی باشد خاقانی خود بطریق تنزل گفتہ است ایں چنیں صفت اسم کسیکہ بعد از خدا ورسول اورا بہ بزرگی تواں ستود چگونہ روا تواند بود ہم چنیں آب دہ دست در بات الف ممدودہ اسم حضرت ختم المرسلین صلوات اللہ علیہ قرار دادہ است ایں نقطیست در غایت رکاکت صفت لفظا۔ پس غالب منع کرتا ہے برہان دکنی کو لفظ رکیک آنحضرت کے حق میں صرف نہ کر چنانکہ ہمداں فصل مفصل نوشتہ ایم

مقصودیت ما انیست کہ ایں چنیں مضامین لغت مستقل وکنایہ مقبول چرا قرار یابد وخرد در شرح اشعارے کہ حادی ایں کلمات باشد چرا نگارش پذیرد اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ اب ترجمہ ماء کا ہندی جس کی پانی اور بمعنی رونق ولطف بھی آتا ہے اور اسلحہ کی تیزی اور جواہر کی صفائی کو بھی کہتے ہیں دست ترجمہ ید ہے جسکی ہندی ہاتھ اور بمعنی قسم ونوع اور بمعنی مسند بھی مستعمل ہے ۔ ہم کو اس مقام میں بمعنی پانی اور دست بمعنی ہاتھ اور اس کی ترکیب یعنی آبدست اور اس کی مقلوب یعنی دست آب کے باب میں کلام ہے آب دست بحرکت وسکون موحدہ عموماً ترجمہ غسالہ ید ہے اور خصوصاً وضو کو کہتے ہیں تصمیم کی سند استاد کا شعر ۔ شعر[1] بے تکلف رو بہ ساقی کن اگر دل خستہ ۔ کابدست او شفا بخش ہمہ بیمارہاست ۔ تخصیص کی سند ملا نام حق کی بیت ۔ بیت ۔ آبدست[2] و نماز باید کرد ۔ دل مقام گداز باید کرد ۔ عرف میں آبدست کس عضو کے غسالے کو کہتے ہیں ہم کو اتنا پوچھ کر چپ ہو رہتے ہیں ۔ پس آب دہ دست اور دست آبدہ کے معنی وضو کردانے والا ہاتھ اور ہاتھ دھلانے والا بمعنی رونق اور دست بمعنی مسند کا یہاں ادخال محض جہل اور صرف اہمال یہ تو میرا قول ہے کہ آب دہ دست رسالت رسول کو کہتے ہیں ایک بے ادب فقط آب دہ دست کہتا ہے اور ہم منہ تکتے ہیں منشی سعادت علی کو نہ علم نہ فہم اس نے اس قباحت کو نہ جانا مرزا رحیم بیگ صاحب افسوس کی بات ہے تم نے اس بیان خاص میں قاطع برہان والے کے قول کو کیونکر مانا ہے سراسر بے پردہ اشرف الانبیا علیہ وآلہ والسلام کی تذلیل اور توہین ہے اور جو ہمبر

---

[1] اگر تو دل شکستہ ہے تو بے تکلف ساقی کی طرف رُخ کر ۔ اس کے ہاتھ کا پانی تمام بیماریوں کو شفا بخشنے والا ہے ۔

[2] وضو اور نماز ادا کرنی چاہیے اور دل کو مقام گداز بنانا چاہیئے ۔

کو ایسا کہے وہ مجموع اہل اسلام کے نزدیک مرتد اور مردود و بے دین ہے بلکہ مخالفین بھی جو مسلمان اپنے پیمبر کو برا کہے اس کو برا جانیں گے یقین ہے۔ پس پیمبر کا آب دہ دست نام رکھنے والا موردِ لعنۃ اللہ و ملائکۃ والناس اجمعین ہے خاقانی کے شعر کے لکھنے سے آپ کی کیا مراد ہے یہ شعر قطعہ بند اور اس کا پہلا شعر مجھ کو یاد ہے پہلے پوچھتا ہوں کہ دست آب دہ کا فاعل اور شین کا مرجع تم نے کس کو ٹھہرایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نشان اس میں بطریق مذکور یا مقدر کہاں پایا جب اس مصرع کی رو سے مصرعہ دست آب دہ مجاورانش دست آبدہ پیمبر کا نام قرار پایا تو دوسرے مصرع کے مطابق مصرع ارزن دہ ہرج کبوترانش۔ ارزن دہ کا خطاب بھی حضرت پر صادق آیا۔ سبحان اللہ۔ جہاں مصطفیٰ، مجتبیٰ رحمۃ للعالمین و خاتم المرسلین آپؐ کے القاب ہیں وہاں آب دہ وست بھی آپ کا لقب ٹھہرا مرزا جی میں ترک جاہل ہوں بجا ہے اگر مجھ کو گالیاں از روئے عتاب دو گے خدا کے واسطے پیمبرؐ کو کیا جواب دو گے بندہ پرور خاقانی کا شعر قطعہ بند ہے اس شعر کا پہلا شعر یہ ہے۔ اشعار روح از آبروے خوردا۔ خلد از پے رنگ و بوے خوردا۔ دست آبدہ مجاورانش ارزن دہ ہرج کبوترانش۔ اوپر کے دونوں مصرعوں میں را کا لفظ زائد پہلا مصرع تیسرے مصرع سے اور دوسرا مصرع چوتھے مصرع سے متعلق۔ نثر اس کی فارسی میں یوں ہوتی ہے (روح از پے آبروئے خود دست آب دہ مجاوران اوست و خلد از پے رنگ و بوے خود ارزن دہ کبوتراں اوست) یہ دونوں شعر کعبہ معظمہ کی تعریف میں اور دونوں شینوں کی ضمیر بطرف کعبہ راجع اس اظہار کی تصدیق تحفۃ العراقین سے کیجئے اور ہندی کے چندی غالب سے سن لیجیے۔ روح اپنی افزائش آبرو کے واسطے وضو کا پانی دیتا ہے کعبہ کے مجاوران کو اور خلد خلد

رنگ و بو کے واسطے دانہ کھلاتا ہے کعبہ کے کبوتروں کو وضو کا پانی دینا اور کبوتروں کو دانہ کھلانا ادنی خدمت ہے۔ خدا کے واسطے محمد صلعم کونین کو خادم کہنا مدح ہے مذمت معہذا خاقانی کے اس مصرع سے دست آب دہ پیمبر صلعم کو سمجھنا بے اعتنائی اور غفلت ہے۔ خاقانی نے روح کو آبدست دہ کا فاعل مانا تم نے پیمبر صلعم کو معاً اس فعل کا فاعل اور ایک فعل کا دو فاعل سے متعلق ہونا کیونکر جائز جانا۔ قافلہ شد یعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت یعنی رسول مقبول صلعم رحلت کرد یہ قاف مع الالف میں کلام اُسی مستہجن رسول کا ہے وست آبدہ کی شرح میں تحقیر اور قافلہ شد میں استہزا ہے۔ برہان قاطع والا اگر یہ قباحتیں نہیں سمجھا ہے تو احمق ہے اور اگر سمجھ کر لکھتا ہے تو کافر مطلق ہے۔ اب میرے خونہابہ بزخم دل کی روانی اور قلم کی خونابہ فشانی دیکھیے۔ تبصرہ۔ مندرجہ حاشیہ ساطع برہان کے حق میں کیا فرماتے ہو اور اس فقرہ اخیر کو (باز درنشیب رکاکت سر انداختند) کس کا لکھا بتاتے ہو۔ سنو فخر الفضلا وختم العلما امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق رحمتہ اللہ علیہ نے رد عقاید وہابیہ میں بزبان فارسی ایک رسالہ لکھا ہے اور اس عہد کے علماء کی اس پر مہریں ہیں اس رسالہ میں جناب مولوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ حضرت کو قوت مجامعت بہت تھی۔ حالانکہ یہ امر واقعی ہے یا یہ کہے کہ آپ کی ردا میلی تھی اگرچہ اُس وقت میں ہو لیکن چونکہ ایک گونہ سوء ادب اور اہانت ہے حاکم اہل اسلام کو چاہیے کہ اس قول کے قائل کو سزا دے اور حاکم سزا نہ دے تو اہل شہر پر عزل حاکم واجب ہے اور اگر اہلِ شہر ایسا نہ کریں تو وہ شہر دار الحرب ہے۔ پس بموجب فتوائے علمائے اسلام فقرۂ مذکور کا لکھنے والا کفر میں شداد سے اشد اور کذب میں مسلیمہ کذاب سے سوا ہے خیر عقبیٰ میں وہ خالق کا مقہور اور دنیا میں اہل خلق کا مطعون ہوگا۔ مجھ کو کیا مجھ کو

کیا مجھے تم پر ہنسی آتی ہے بعض بات سمجھی نہیں جاتی ہے۔ خاقانی روح کو آب دست وہ مجاوران حرم کہتا ہے تم کہتے ہو کہ خاقانی دست آب دہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتا ہے مولوی امام بخش نے تم کو بہت کچھ پڑھایا مگر طریقۂ استنباط معنی نہ بتایا میرے حق میں جو کہتے ہو خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہتے ہو میں نے اس کے سوا (کہ خاقانی بطریق تنزل گفتہ است) اور کیا کہا ہے جو مجھے بُرا کہتے ہو وہ بھی ذکر شیر شرزہ غاب میں نہ دستاب دہ کے باب میں اس نے جناب امیر المومنین کے واسطے ایک لفظ سہل سرسری لکھا میں نے قبول نہ کیا اور اس قول کا تنزل ظاہر کر دیا آنحضرت کو اس نے آب دہ وست یا دستاب دہ کہاں لکھا اور کیوں لکھتا نہ احمق تھا نہ بے ادب، جب اس نے نہیں لکھا تھا تو میں اس سے کیوں اُلجھوں اور کب اُلجھا نہ کج فہم ہوں نہ مغلوب الغضب آبدہ دست کے پردے کھل گئے بے اضافہ لفظ آخر دست بمعنی مسند نہ آئے گا آبدہ دست ہاتھ دُھلانے والا کہلائے گا ہاں ایک طور ہے تم نے اس کو اور طور سے لکھا ہے میں بطریق ابلغ واحسن لکھتا ہوں یعنی تخت اورنگ سلاطین کے جلوس کے واسطے اور وسادہ و مسند امرا کے جلوس کے واسطے موضوع ہے۔ نظر اس اصل پر سلطان کو زیب افزائے اورنگ بے اضافہ سلطنت اور امیر کو زینت بخش مسند بے افزائش لفظ امارت لکھو ابنیا، خصوصاً سید الانبیا مسند پر کب بیٹھے تھے ان کے غلاموں کو امارت ننگ ہے اور زمزمۂ الفخر فقری بلند آہنگ ہے میرے خداوند کا فرش حصیر شمار گلیم ردائے صحابہ سطح خاک میں مومن مجرم اپنے اس خداوند کو جس کی شان میں یہ مصرع اگر مدح مجمل ہے مصرع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر لیکن قول فیصل ہے۔ آبدہ دست و زینت بخش مسند کیونکر سمجھوں بلکہ مجموع اہلِ اسلام بشرطیکہ فہم صحیح و طبع سلیم گوارہ نہ کریں گے وہ صفت عام جو دنیاداروں

کے واسطے ہے قبلہ دین و دنیا پر صادق آئے دکنی اور اس کے فضلہ خوار قابل خطاب نہیں ایہا الاخ المکرم فضلہ خوار جواب ہے پس گردان جناب کا یہ کلمہ مستوجب عتاب نہیں بیقین کہ آپ نے اب از روئے دلالت لفظ و معنی جان لیا ہوگا اور اس فقیر حقیر کو نظر بہ قومیت ترک و پیشۂ آبائی سپہ گری عسس المحققین خطاب دیا ہوگا جاننا اس امر کا کہ آپ دہ وست میں اگر آب سے پانی اور دست سے ہاتھ مراد لیں تو اس کو اسم پیمبر سمجھنا کتنی بے ادبی ہے۔ اور اگر آپ کو بمعنی رونق اور دست کو بمعنی مسند مانیں تو بے الحاق لفظ نبوت و ہدایت حضرت کو اس ترکیب کا منشا والیہ سمجھنا کیسی بوالعجبی ہے آبدہ دست رونق بخش مسند صفت ہے عموماً منصبان مالدار کی یہاں تک کہ اس اصطلاح سے تعریف کر سکتے ہیں صرافان و ساہوکاران بلاد و امصار کی میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بکمال تعظیم سلام کرتا ہوں پیمبر کی تحقیر کو مسلّم رکھتے ہو تم جانو اور سیّد ابرار خاقانی پر بہتان کرتے ہو تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہسوار مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے معقول اور راست نہیں لیکن واقعہ مجھ کو عرصۂ محشر میں اس کی باز خواست نہیں شعر

زہمن عشق بکونین صلح کل کردیم[1]
تو خصم باش وز ما دوستی تماشا کن

عود ہندی صفحات ۲۰۲/۲۱۸

---

[1] عشق کی برکت سے ہم نے دونوں جہان سے صلح کل کرلی تو یوں ہی دشمن رہ اور ہماری طرف سے دوستی دیکھتا جا۔

مکتوب بنام

مفتی سید محمد عباس

قبلہ حضرت کا نوازش نامہ آیا میں نے اس کو حرزِ بازو بنایا۔ آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایۂ عزّ و وقار ہے فقیر امیدوار ہے کہ یہ دفترِ بے معنی نہ سرسری بلکہ سراسر دیکھا جائے نہ پیش نظر دھرا رہے بلکہ اکثر دیکھا جائے میں نے جو نسخہ وہاں بھجوایا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے نہ ہٹ دھرم ہوں نہ مجھے اپنی بات کی پچ ہے دیباچہ و خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے کلام کی حقیقت کی داد چاہتا ہوں طرزِ عبارت کی داد چاہتا ہوں۔ نگارشات لطافت سے خالی نہ ہوگی گزارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں مطابق اہلِ پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں مناسبت خداداد تربیت استاد سے حسن و قبح ترکیب پہچاننے لگا فارسی کے غوامض جاننے لگا بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا قاطع برہان کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں ابال آیا لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا ہے یہ کیا بارِ معارض اکابر سلف ہوا ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع برہان کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت برہان قاطع و قاطع برہان ایک نمط ہے برہان قاطع نے کیا نیتو نتن سکھ لٹھا قطع کیا ہے جواب نے اس کو قاطع لقب دیا۔ برہان جب تک غیر کی کسی برہان کو قطع نہ

کرے گی کیونکر قاطع نام پائے گی برہان قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجیے گا وہ قاطع برہان کی صحت کی ثبوت کے کام آئے گی قطعۂ تاریخ کا کیا کہنا گویا یہ کتاب معشوق اور یہ قطعہ اس کا گہنا ہے۔ جناب نواب صاحب کا نیاز مند اور بندۂ فرمانبردار ہوں بعد عرض سلام شعر کے پسند آنے کا شکر گزار ہوں آپ کے علم و فضل و فہم و ادراک کی جو تعریف کی جائے وہ حق ہے لیکن میرے شعر کی تعریف صرف خریداری دکان بے رونق ہے۔

(عود ہندی ۲۳۹/۲۴۰)

مکتوب بنام

خواجہ غلام غوث بیخبرؔ

جنابِ عالی آج دو شنبہ ۳ر جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے پہر دن چڑھا ہوگا۔ ابر گھر رہا ہے ترشح ہو رہا ہے ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو کچھ میسّر نہیں ناچار روٹی کھائی ہے بیت افقہا پرازابر بہمن مئی[۵۱]۔ سفالینۂ جام من از مے تہی۔ غمزدہ دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا سرنامہ کو دیکھ کر اس راہ سے کہ دستخط خاص کا لکھا ہوا ہے بہت خوش ہوا خط کو پڑھ کر اس رو سے کہ حصول مدّعا کے ذکر سے حاوی نہ تھا افسردگی حاصل ہوئی شعر ما خانہ رمیدگان ظلمیم[۵۲]۔ پیغام خوش از دیار ما نیست اسی افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کر لوں یا آنکہ خط جواب طلب نہ تھا جواب لکھنے لگا پہلے تو یہ سنیے کہ آپ کے دوست کو آپ کا خط پہونچ گیا مگر وہ دوبار مجھ کو لکھ چکا ہے کہ میں جواب اس کا نشان مرقومۂ لفافہ کے مطابق ڈاک میں بھیج چکا ہوں جواب الجواب کا منتظر ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ کمال یاس مقتضی استغنا ہے۔ بس اب اس سے زیادہ یاس کیا ہوگی کہ بامید مرگ جیتا ہوں اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا ہے

---

۵۱ کنارے آسمان کے ماہ بہمن کی گھٹا سے بھرے ہیں۔ اور میرا مٹی کا پیالہ شراب سے خالی ہے۔

۵۲ ہم وہ لوگ ہیں جو ظلم کے گھر سے بھاگے ہیں۔ ہمارے دیار سے کوئی خوشی کا پیغام نہیں آسکتا۔

چلا ہوں دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گزر جائیگی جانتا ہوں تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے بیس تیس برس سے یہ قطعہ لکھا رکھا ہے۔ قطعہ

من کہ باشم کہ جاوداں باشم[1]
چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بگویند در کدامیں سال
مرد غالبؔ بگو کہ غالب مرد

اب بادہ سو چھتر ہیں اور غالبؔ مرد کے بارہ سو ستتر ہیں اس عرصہ میں جو کچھ مسرت پہنچتی ہو پہنچ لے ورنہ پھر ہم کہاں۔ ۱۲

(عود ہندی صفحات ۱۷۴/۱۷۵)
اردوئے معلی صفحات ۲۶۹/۲۷۰

---

[1] میں کون ہوں جو ہمیشہ زندہ رہونگا جبکہ نظیری بھی نہیں رہا اور طالب ایسا شاعر بھی مرگیا اور اگر پوچھیں کہ غالب کس سال میں مرا تو کہہ دینا کہ "غالب مرد" یہی مادہ تاریخ ہے۔ ۱۲

جناب عالی ایک شعر استاد کا مدت سے تحویل حافظہ چلا آتا ہے شعر

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے ازراہ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی۔ شعر

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو تمھاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوشتر ہے۔ ہاں حضرت کہئے ممتاز علی خاں کی سعی بھی مشکور ہوگی وہ مجموعہ اردو چھپا یا چھپا ہی رہیگا۔ احباب اس کے طالب ہیں بلکہ بعض نے طلب کو بہ سرحد تقاضا پہنچا دیا ہے۔ میرا حال سنیے۔ لارڈ کیننگ صاحب نے بعد فتح دلی میرا قصیدہ مجھ کو بھیج دیا صاحب سکریٹر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایام غدر میں بادشاہ باغی کے مصاحب رہے اب گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم آمیزش منظور نہیں ناچار چپ ہو رہا۔ بے حیا ہوں لارڈ ایلجن صاحب بہادر کے وقت میں پھر موافق معمول قصیدہ شملہ کے مقامات پر بھیجا یا خلاف تصور بحسب دستور قدیم چیف سکرٹر بہادر کا خط آگیا وہی اختصاصی کاغذ وہی القاب وہی تحسین کلام وہی اظہار خوشنودی اب جو یہ امر کبیر دائسرائے قلمرو ہند ہوئے ہیں خدمت دیرینہ بجا لایا ۱۳ر فروری ۱۸۶۴ء حال

کو قصیدہ مع عرضداشت ارسال کیا۔ آج تک کہ ۷ رمارچ کی ہے جواب نہیں پایا باوجود سوابق معرفت رسم قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو مصرعہ

بے دل نیم ہنوز بہ بینم چہ می شود[1]

(عود ہندی صفحات ۱۷۷/۱۷۸)

---

[1] میں ابھی بے دل نہیں ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے ۱۲

بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو بڑھاپے میں ایک حکم بجا لا دے تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے تو اس مجموعہ کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں بیت

رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے حضرت وہ شعر بیگانی زبان کا ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغاں لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے ؎

تم کہے تھے رات میں آئینگے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

والسلام بالوف الاحترام

(عود ہندی صفحہ ۱۸۲)

قبلہ میرا ایک شعر[1]

خود پیش خود کفیل گرفتاری من ست
ہر دم بہ پرسش دل مایوس میرسد

یہ معاملہ میرا اور آپ کا ہے خارج مسموع ہوا کہ میں نے جو اغلاط برہان قاطع کے نکال کر ایک نسخہ موسوم بہ قاطع برہان لکھا ہے اور ایک مجلد اس کا آپ کو بھیج دیا ہے۔ آپ اس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھ رہے ہیں اگرچہ باور نہیں آیا لیکن عجب آیا ایک مولوی نجف علی صاحب ہیں باوجود فضیلت علم عربی فارسی دانی میں ان کا نظیر نہیں وہ ایک شخص مجہول الحال نے اہل دہلی میں سے میرے کلام کی تردید میں کتاب تصنیف کی ہے مسمیٰ بہ محرق قاطع برہان انھوں نے اس کی توہین اور مسودے کی تفضیح میں دو جزو کا ایک نسخہ مختصر لکھا ہے اور ایک طالب علم مسمیٰ بہ عبدالکریم نے سعادت علی مؤلف محرق قاطع سے سوالات کیے ہیں اور ایک محضر اس نے بفتوے علمائے شہر مرتب کیا ہے ایک میرے دوست نے بصرف زر اس کو چھپوایا ہے ایک نسخہ اس کا آج اسی خط کے ساتھ بہ سبیل پارسل ارسال کیا ہے اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے پھول والوں کا میلہ کہلاتا ہے بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا

---

[1] اپنے سامنے اب میری گرفتاری کا کفیل ہے۔ ہر وقت دل مایوس کی پرستش کیے جاتا ہوں

ہے امرائے شہر سے لیکر اہل حرفہ تک قطب صاحب جاتے ہیں دو تین ہفتہ تک وہیں رہتے ہیں مسلمین و ہنود دونوں فرقے شہر میں دکانیں بند پڑی رہتی ہیں بھائی ضیاالدین خان اور شہاب الدین خان اور میرے دونوں لڑکے سب قطب ہو گئے ہیں۔ اب دیوان خانے میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیمار خدمت گار۔ بھائی صاحب جب وہاں سے آئینگے تو مقرر آپ کو خط لکھیں گے۔ بڑے پہاڑ سے اترے چھوٹے پہاڑ پر چڑھ گئے، عدم تحریر کی وجہ یہ ہے۔

(عود ہندی صفحہ ۱۸۳)

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں
یعنی سبق سوق مکرر نہ ہوا تھا

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے یوں تنا مجھے یاد رہ آیا یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا جھگڑا استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میر منشی نواب لفٹننٹ گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں اولیا کا یہ حال ہے وائے برحال ہم اشقیا کے یہ حکایت ہے شکایت نہیں ہے میں دنیا داری کے لباس میں فقیری کر رہا ہوں لیکن فقیر آزادانہ شیاد[1] کباد ستر برس کی عمر ہے بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے زمرہ خواص میں سے عوام کا شمار نہیں دو مخلص صادق الولا دیکھے ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ وہ سرا دوست خیر خواہ خلق حسن و جمال بچشم بد دور کمال مہر و وفا صدق و صفا نور علیٰ نور میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں۔ شعر

---

[1] شیاد کیاد۔ مکار فریبی

نگہم نقب ہمی زد بہ نہانخانۂ دل[1]
مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میداں رفتم

غایت مہر و محبت جس کے ملکے کا تم کو مالک سمجھتا ہوں وہ بہ نسبت اپنے اس قدر یقین کرتا ہوں کہ پہلے آدمیوں کو اپنے بعد اپنا ماتمدار سمجھا ہوا تھا ایک تو میں رو لیا اب اللہ آمین کا ایک دوست رہ گیا دعائیں مانگتا ہوں کہ خدا یا اس کا داغ نہ مجھے دکھائیو اس کے سامنے مروں میاں تمھارا عاشق صادق ہوں بھائی ابھی قطب سے نہیں آئے۔ دافع ہزیان[2] کی دو مجلد اور بھیج دونگا۔

(عود ہندی صفحات $\frac{۱۸۴}{۱۸۵}$)

---

[1] میری نگاہ نہان خانۂ دل میں نقب لگاتی ہے (یعنی حال معلوم کرتی ہے) اہل ریا کو مژدہ ہو کہ میں میدان سے گیا۔

[2] ایک کتاب جو برہان قاطع کے جھگڑے میں مرزا صاحب کی موافقت میں لکھی گئی۔

قبلہ کل خط آیا آج جواب لکھتا ہوں پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتنا ہنسوں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں اور آنکھ سے آنسو نکل آئیں فقرہ بڑھاپے میں کیا جانیے کہاں کی حرارت مزاج میں آ گئی ہے فقط۔ کیوں صاحب تم نے بڈھوں میں اپنا نام لکھوایا تو مجھ کو لازم ہے میں اپنے کو اموات میں گنوں تمھاری عمر میرے نزدیک پچاس سے متجاوز نہ ہوگی اگر تجاوز کیا ہوگا تو دو تین برس سے وہ تجاوز زیادہ نہ ہوگا، بھائی ضیاالدین اور تم ہم عمر ہو وہ کچھ کم پچاس تم کچھ اوپر پچاس ابھی تم دونوں صاحبوں کو ایک سو بیس برس میں سے ستر برس یا کچھ کم ستر برس باقی ہیں ۱۲۔ بنا بہ آب رسیدن لازمی اور بنا بہ آب رساند متعدی باجماع جمہور اضداد میں سے ہے، ہم بمعنی استحکام و ہم بمعنی انہدام در صورت استحکام نیو کا گھر کھودنا ملحوظ ہے اور در صورت انہدام تلطمہ امواج سیلاب مد نظر ہے آپ کے لکھے ہوئے دونوں شعر مفید معنی خرابی ہیں۔ صائب مصرعہ

بنائے عمر مسیح و خضر باب رسید

یعنی ویران ہو گئی ڈھے گئی حالانکہ وہ یقیناً جاودانی تھی۔ مصرعہ

ہنوز تشنۂ خونست تیغ مژگانش

باآنکہ تیغ مژہ نے دو زندہ جاوید کو مارا مگر اب تک تشنۂ خوں ہے تشنہ بمعنی مشتاق اور خون بمعنی قتل اور بنائے عمر بہ آب رسیدن استعارۂ اہلاک۔ شعر

ہزار میکدہ را محتسب آب رساند
بنائے صومعۂ شید ہمچناں برپاست

بنائے میکدہ غلط ہزار میکدہ صحیح ہے حکیم کے دیوان میں موجود یعنی محتسب نے ہزار میکدہ ڈھادیے دریا برد کردیے صومعۂ زرق دریا اب تک معمور اور موجود ہے بمعنی استحکام نعمت خان علی کہتا ہے۔ شعر

نیست محکم گر رسد بنیاد دنیا تا آب
چوں حباب ایں خانہ بے بنیاد میدانیم ما

یعنی اگر دنیا کی بنیاد پانی تک پہنچ جائے تو بھی مضبوط نہیں ہے ہم حباب کی طرح اس گھر کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ ۱۲

صائب کہتا ہے شعر[1]

چگونہ شمع تجلی ز رشک نگدازد
رخ تو خانہ آئینہ را آب رساند

نون موقوف ۱۲ غالب کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدہ میں اگر توغل[2] رہے تو ہزار بات نئی ہوتی ہے میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیے وہ مجلسوں میں گانے لگا اکبر آباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔ مطلع[3]

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

---

[1] شمع تجلی رشک سے کیوں نہ پگھل جائے تیرے رخسارے نے آئینہ خانہ کی بنیاد برباد کردی۔ [2] مجازاً مشغولیت

[3] جسم سے جان کا نقاب کب تک۔ یہ خزانہ اس ویرانے میں کہاں تک۔

ایک صاحب آگرہ میں ایک صاحب لکھنؤ میں معترض ہوئے کہ گنج در خرابہ باید نہ در خراب۔ ہر چند کہا کہ خرابہ مزید علیہ اور اصلی لغت خراب عربی الاصل بمعنی ویران و ویرانہ ہے جس کی ہندی اوجڑ معترض مصر رہا صائب کے دیوان میں سے یہ مطلع نکالا۔ مطلع ؎

بہ فکر دل نہ فتادی بہیچ باب دریغ ؎[1]
بگنج راہ نبردی دریں خراب دریغ

(عود ہندی صفحات ۱۸۶/۱۸۸)

---

[1] تو نے کسی باب میں افسوس کر دل کی فکر نہ کی اس ویرانے میں تو افسوس ہے کہ خزانے تک نہ پہنچ سکا۔ ۱۲

قبلہ آج تیسرا دن ہے کہ میں بنا بہ آب رسیدن و آب رساندن کی حقیقت با استناد اشعار اساتذہ لکھ کر بسبیل ڈاک بھیج چکا ہوں آج اس وقت بھائی ضیاء الدین خاں صاحب آئے اور اس امر خاص میں کلام کے بادی ہوئے میری تقریر سن کر کہنے لگے کہ آب در بنا رسیدن و آب در بنا رسیدن کے باب میں متردد ہیں کہ آیا یہ ترکیب جائز ہے یا نہیں اب میں متنبہ ہوا کہ واقعی جو میں نے لکھا وہ سوال دیگر جواب تھا ستر سال کا پیر خرف حواس معرض تلف اگرچہ سوال کو غلط سمجھا لیکن غلط نہیں لکھا رسیدن بنا باب ہم معنی استحکام بنا و ہم بمعنی انہدام بنا درست فقط آب آب در بنا رسیدن و رساندن کی کیفیت سنئے فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی پس میں اس کی صحت اور غلطی میں کلام نہیں کر سکتا جانب غلطی میرے نزدیک راجح ہے آپ جب تک کلام اہل زبان میں نہ دیکھ لیں اس کو جائز نہ جانیے گا مگر کلام سعدی و نظامی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے نہ آرزو اور واقف اور قتیل و غیرہم کا میرا ایک مطلع ہے۔ شعر

از جسم بجاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک گروہ معارض[1] ہوا کہ گنج کو خرابہ کہو نہ خراب میں متحیر کہ یارب کس سے کہوں

---

[1] معترض

خرابہ مزید علیہ خراب ہے مثل ویران و ویرانہ و موج موجہ الحاق ہائے ہوز سے لغت دوسرا نہیں پیدا ہوا اور صائب کے دیوان میں ایک مطلع نظر آیا۔ بیت

بفکر دل نہ فتادی بہ پیچ تاب دریغ
بگنج راہ بنبردی دریں خراب دریغ

یہ مطلع لکھ کر معترض صاحبوں کو بھیج دیا کہ غالب کو دردِ سر نہ دیجے جو پوچھنا ہو وہ صائب سے پوچھ لیجے عارف علی شاہ خراسانی نے اسی مطلع پر شعر از جسم بجاں نقاب تا کے۔ ایں گنج دریں خراب تا کے۔ تین اعتراض کیے تھے پہلا نقاب کے ساتھ عارض و رخ کا ذکر بھی ضرور تھا وہ نہیں ہے دوسرا گنج تو ویرانے ہی میں ہوتا ہے پھر اس پر تاسف کیا جو کہتے ہیں تا کے تیسرا ویرانہ کو خرابہ کہتے ہیں نہ خراب ہوتا ہے پھر اس پر تاسف کیا جو کہتے ہیں تا کے تیسرا ویرانہ کو خرابہ کہتے ہیں نہ خراب اور ان اعتراضوں کے بعد انھوں نے دخل کیا تھا ؎

از جسم بجاں حجاب تا کے
گل بر رخ آفتاب تا کے

خراب اور خرابہ کا جواب تو صاحب مطلع اوپر کے خطوں میں لکھ چکے ہیں یہ خط بقیہ اعتراضوں کے جواب اور دخل کے بیجا ہونے کے اظہار میں ہے۔

(عود ہندی صفحات ۱۸۹/۱۹۱)

قبلہ دیکھیے ہم عارف ہیں وارد نامہ سے پہلے جواب نامہ لکھتے ہیں۔ دن بھول گیا ہوں غالب کہ آج تیسرا دن ہو صبح کو میں نے آپ در بنا رسیدن کی بحث میں خلاصۂ تحقیق لکھ کر ارسال کیا اسی دن شام کو آپ کا خط آیا بقیۂ جواب اب لکھتا ہوں نقاب اس شعر میں حائل ہے حول کو وجہ در رخ کی خصوصیت نہیں دو چیزوں کے بیچ میں جو شے آجائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جو چیز ایک چیز کی مانع نظارہ ہو وہ نقاب ہے اس شئے نامرئی[1] کی رخ کا رخ بمناسب نقاب مقدر ہے اور یہ تقدیر جائز اور بلیغ ہے حجاب کا یہاں اوپری یعنی بے محل اور نا ملائم ہونا بالشرط عقل سلیم و طبع لطیف ظاہر ہے گل خاک با آب آمیختہ کو کہتے ہیں وہ رخ آفتاب تک کہاں پہنچے ہاں گرد و غبار میں آفتاب چھپ جاتا ہے اس کا استعمال از روئے مجاز جائز ہے۔ گنج در ویرانہ تا کے یہ بہت لطیف بات ہے یعنی افسوس کیا جاتا ہے اس گنج کے بیکار ہونے کا گنج سے غرض یہی تو نہیں کہ جنگل میں مدفون رہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ مدفن سے نکلے اور صرف ہو اور لوگ اس کے وجود سے تمتع پائیں یہاں ایک اور دقیقہ ہے کہ اس شعر میں گنج مشبہ بہ اور روح انسانی مشبہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ روح کا تعلق جسم سے جاودانی نہیں پس کیا قباحت ہے اگر ایک غمزدہ ستم زدہ

---

[1] وہ چیز جو دکھائی نہ دے۔

قطع تعلق روح کا منتظر ہے اور مشتاق ہو مثلاً ایک میعادی محبوس حسرت تمندانہ کہے کہ الٰہی وہ دن کب آئیگا کہ میں قید سے نجات پاؤں کب تک سڑک کاٹوں کب تک رنج اٹھاؤں فاخر مکیں ایک شاعر تھا شجاع الدولہ آصف الدولہ کے عہد میں اس نے سعدی و نظامی وحزیں کے اشعار کو اصلاحیں دی ہیں جب ایک ہندوستانی بے علم تنک مایہ اساتذہ نامی عجم کے کلام کو اصلاح دے اگر ایک عالم خراسانی نے ایک ہندی کے مطلع میں تصرف کیا تو کیا قباحت لازم آئی۔ خدا کا شکر کہ مجھ کو ستر برس کی عمر میں پچاس برس کی مشق کے بعد استاد میسّر آیا۔

(عود ہندی صفحات ۱۹۱/۱۹۲)

حضرت پیر و مرشد اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ میں صاحب فراش ہوں اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہو خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ تفتہ کو میں نے خط نہیں لکھا اشعار ان کے آئے اصلاح دیدی نشان اصلاح جا بجا حاشیہ پر لکھ دیا کل جو عنایت نامہ آیا اس میں بھی دیباچہ کا اشارہ اور تفتہ کے خطوط کا حکم مندرج پایا ناچار تحریر سابق کا اعادہ کر کے حکم بجا لایا ناظرین قاطع برہان پر روشن ہوگا کہ نامراد اور بے مراد کا ذکر مبنی اس پر ہے کہ عبدالواسع ہانسوی بے مراد کو صحیح اور نامراد کو غلط لکھتا ہے۔ میں لکھتا ہوں کہ ترکیبیں دونوں صحیح لیکن بے مراد غنی کو کہتے ہیں اور نامراد محتاج کو۔ اب آپ کے نزدیک اگر ان دونوں کا محل استعمال ایک ہی ہو تو میرا مدعائے اصلی یعنی نامراد کی ترکیب علی الرغم[1] عبدالواسع کے صحیح ہونا فوت نہیں۔ شعر مرزا صائب

نامرادی[2] زندگی بر خویش آساں کردن است
ترک جمعیت دل خود را بساماں کردن است

یہاں نامرادی بے مرادی کے معنی کیونکر دیگی اغنیا خواہ اہل توکل خواہ اہل تمول متمولین پر کبھی کام آسان نہیں ہوتا بلکہ مفلسوں سے زیادہ ان پر مشکلیں رہیں اہل توکل ان کی ضنعتیں اور ہیں وہ اہل اللہ ہیں، مقربان بارگاہِ کبریا ہیں دنیا پرپشت پا مارے ہوئے

---

[1] بخلاف۔ [2] نامرادی کیا چیز ہے زندگی کو اپنے اوپر آسان کر لینا۔ دل جمعی کی خواہش ترک کر دینا۔ اپنی خاطر جمعی کا باعث ہے۔

ہیں کام ان پر کب مشکل ہے کہ انھوں نے اس کو آسان کر دیا نامراد صیغۂ مفرد ہے مساکین
کا اصناف مساکین کی شرح ضرور نہیں سخنی کشی، دبینوائی و تہی دستی و گدائی یہ اوصاف
ہیں مساکین کے ان صفات میں سے ایک صفت جس میں پائی جاوے وہ مسکین و نامراد
البتہ مساکین پر نہ ایک کام بلکہ سب کام آسان ہیں نہ پاس ناموس و عزت نہ حب جاہ و
مکنت نہ کسی کے مدعی نہ کسی کے مدعا علیہ دن رات میں دو بار روٹی ملی بہت خوش ایک بار
ملی بہر حال خوش خدا کے واسطے مولانا کے شعر میں نامراد بمعنی کسے کہ ہیچ مراد نداشتہ
باشد کیونکر ثابت ہوتا ہے مساکین کی زندگی جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں آسان گزرتی
ہے یا اغنیا کی۔ رہا مولوی معنوی علیہ الرحمہ کا یہ شعر بیت عاقلاں از بے مرادیہائے خویش
باخبر گشتند از مولائے خویش میں نے مثنوی کے ایک نسخہ میں عاقلاں کی جگہ عاشقاں
دیکھا ہے بہر صورت معنی یہ ہیں کہ عشاق یا عقلا بعد ریاضت شاقہ ماسوائے اللہ سے
اعتراض کر کے بے مراد اور بے مدعا ہو گئے یہ پایۂ تسلیم و رضا ہے البتہ اس رتبہ کے
آدمی کو خدا سے لگاؤ پیدا ہو گا مصرعہ باخبر گشتند از مولائے خویش۔ یہاں بھی
بے مرادی سے نامرادی کے معنی نہیں لیے جاتے مگر ہاں مصرعہ بے مرادی مومناں از
نیک و بد دوسرا مصرعہ در دلکی بے مرادت داشتی۔ ان دونوں مصرعوں میں نامراد
اور بے مرادی کے معنی میں خلط واقع ہو گیا ہے۔ خیر بے مراد اور نامراد ایک سہی ہر
چند دوسرے مصرع مولوی میں بے مراد کے معنی بے حاجت کے درست ہوتے ہیں، مگر
مصرع من کہ نہ مدم شیوۂ من نیست بخت۔ زیادہ تکرار کیوں کروں معہذا مصرع
اول کی کچھ توجیہہ بھی نہیں کر سکتا۔ نامراد کی ترکیب کی صحت علی الرغم عبد الواسع
ثابت ہو گئی۔ فثبت المدعا[1] کمال یہ کہ مانند ناچار و بیچارہ اور نا انصاف اور بے انصاف
کے نامراد اور بے مراد کا بھی مورد استعمال مشترک رہا۔ والسلام

(عود ہندی صفحات ۱۹۷/۱۹۹)

۱۔ پس مدعا ثابت ہوا۔

مکتوب بنام
کلب علی خاں والیٔ رامپور

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

نوٹ :- مندرجۂ بالا شعر کے تاریخی پس منظر کی وضاحت غالب نے نواب کلب علیخاں سابق والی رامپور کو خط میں کی ہے جو قصۂ داستان امیر حمزہ کے متعلق روشنی ڈالتا ہو لکھتے ہیں:

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے داستان امیر حمزہ قصہ موضوعی ہے شاہ عباس ثانی کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان اس کو کہتے ہیں اور ایران میں رموز حمزہ اس کا نام ہے دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے اب تک مشہور ہے اور ہمیشہ رہے گا آپ کے اس تکیۂ دار روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کے ابیات اور مدح اشعار میں حمزہ داد یلا حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ ان کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان میں آئے سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں۔ حضرت اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے مگر جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہے گا یہ قصیدہ بھی شہرت پذیر رہیگا۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب ۱۲ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

اسی مکتوب کے ذیل ۵۴ اشعار کا مذکورہ قصیدہ مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی ایڈیشن ۱۹۴۳ء صفحات $\frac{42}{44}$ پر درج ہے۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر نے دی برد لیالی نے مجھے

نوٹ: غالب نے ایک خود نوشتہ بنام کلب علی خاں والی رامپور میں اس حادثہ کے سلسلے میں لکھا تھا جو رامپور سے واپسی پر دلی پر مراد آباد میں دریا پار کرتے وقت پیش آیا تھا پورا خط ملاحظہ ہو:

بعد تسلیم معروض ہے مراد آباد پہنچا بعد پالکی کے اترالی کے پل کا ٹوٹ جانا اسباب یہاں تک کہ رخت خواب کا مع آدمیوں کے اس زمہریر کے میدان میں رہنا بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا خیر جو ان پر گزری وہ جانیں میں مراد آباد کے سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا بھوکا پیاسا کمبل اوڑھ کر پڑا رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ کر صبح کی (شعر اوپر درج ہے) صبح کو خستہ و رنجور اٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خان بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعد الدین صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی ناگاہ مولوی محمد حسن خان صاحب بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں آکر مجھ سے ملے دوسرے دن وہ رہگرائے دار السرور رام پور، اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوا دو شنبہ ۲۰ شعبان اور ۲۸ جنوری ۱۸۶۶ء غم کدہ پہ پہنچا حضور کے اقبال کی تائید تھی ورنہ

میں اور بیتا دلی پہنچا ؎

مغلوب غلبۂ غم دل غالب حزیں   کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
از رامپور زندہ بہ دہلی رسیدہ است   مارا بدیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

نجات کا طالب غالب

چار شنبہ ۲۲ شعبان ۱۰ جنوری سال جشن حضور

(مکاتیب غالب صفحات ۴۸/۴۹)

نوٹ: اسی سلسلے کا ایک شعر اور ہے جس میں "ساحل آئے، دل آئے" والی غزل میں ملاحظہ ہو (مرتب)

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت بعد تسلیم معروض ہے کہ ایک قطعہ بھیجتا ہوں
حضور ملاحظہ فرمائیں مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا زیادہ
حد ادب۔ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب ۵ رجب ۱۲۷۴ ہجری

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں — حیدر آباد دکن رشک گلستان ارم
رامپور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر — کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ — اس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
رامپور آج وہ بقعۂ نور کہ ہے — مرجع و مجمع اشراف نژاد آدم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں — ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دست کرم
ابر دست کرم کلب علی خاں سے دوام — در شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آجائے جسے ہو نہ یقیں — سبزہ و برگ گل لالہ پہ دیکھے شبنم
حبذا باغ ہمایوں تقدس آثار — کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالان حرم
مسلک شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس — خضر بھی یاں اگر آجائے تو لے انکے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہل سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے باغراق رقم
حق سے کیا مانگیے ان کے لیے جب ہو موجود — ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ پہ مائل نہ غلو کے قائل — دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا غالب عاصی کے خداوند کو دے — دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اولاً عمر طبیعی بہ دوام اقبال — ثانیاً دولت دیدار شہنشاہ امم

(مکاتیب غالب ۷۵/۷۶)

بعد تسلیم معروض ہے کہ جب بادشاہ دلّی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک طویل غزل طرز تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے۔ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا۔ وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس ‏ ‏ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ‏ ‏ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل ‏ ‏ انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے ‏ ‏ لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے ‏ ‏ آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ‏ ‏ لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ‏ ‏ رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کے لیے ‏ ‏ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

قطعہ

در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم ‏ ‏ شائستہ گدائے ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں قابل خدمت نہیں اسد ‏ ‏ خیرات خوار محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

(مکاتیب غالب صفحات ۵۲، ۵۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے حق تعالی جل جلالہٗ و عم نوالہٗ جس گروہ پر مہربان ہوتا ہے وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے کہ وہ بہ قوت عادلہ کفر و بدعت کو جڑ سے اکھاڑ ڈالے اور بہ صفت رحم رعایا کو پالے مصداق اس کا ذات قدسی صفات جناب عالی ہے کہ قمار خانہ کی بنا اٹھا ڈالی ہے زہے قانون سیاست غلہ کا محصول معاف کر دیا ہے روپیہ رعیت پر نثار کیا ہے زہے آئین ریاست۔ رباعی

نواب کہ شد ز شوکت اقبالش
بخشیدن باج غلہ از اقبالش
فارغ شد ہر کسی و دو داد فراغ
ہم فارغ دہم فراغ باشد اقبالش

پیر و مرشد حضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں انعام کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی وہ قصیدہ مدحیہ میرے دیوان فارسی میں مرقوم اور وہ دیوان فارسی حضرت کے کتاب خانے میں موجود ہے خطوں کی تصدیق از روے دفتر ہو سکتی ہے یہ رسم بری نہیں ہے۔ جاری رہے تو بہتر ہے زیادہ حد ادب۔

التفات کا طالب غالب
پنجشنبہ ۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ

(مکاتیب غالب صفحات ۳۶/۳۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت: بعد تسلیم معروض ہے اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اٹھا "مرا از آں مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است" یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکان بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا استاد اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اوس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریق یاد نہیں۔

میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید، راقم فرہنگ رشیدی، علمائے عجم میں سے نہیں۔ ہندی ان کا مولد ماخذ ان کا اشعار قدما، ہادی ان کا، ان کا قیاس۔ ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی نورٌ علیٰ نور۔

فقیر اشعار قدما کا معتقد۔ اون لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات اون کے کلام میں ہیں اوس کے معنی تو اہل ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں انکے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ ادتنگ و اتزنگ متحد المعنی اور آشیاں ساختن و بستن و چیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے تو میں نے بیکلف

مان لیا لیکن نہ اون حاجبوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق ؏

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت عز و جاہ روز افزوں

انصاف کا طالب غالب

۱۷/اکتوبر ۱۸۶۶ء

(مکاتیب غالب صفحات ۶۰/۶۱)

بعد تسلیم و تعظیم معروض ہے ہنڈوی ملفوفہ نوازش نامہ کے ذریعہ سے سو روپے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے۔

ایک رباعی بھیجتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ دبدبۂ سکندری کے آغاز میں اسکے چھاپنے کا التزام رہے ؎

آں کیست کہ جسم ملک را جا باشد
آں کیست کہ ہمسر سلیماں باشد
آں کیست کہ انجمش بفرماں باشد
کس نیست مگر کلب علی خاں باشد

نجات کا طالب غالب
۵ ستمبر ۱۸۶۷ء
(مکاتیب غالب صفحات ۷۲ تا ۷۳)

مکتوب بنام

صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بیتابؔ

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے وہ بہت خوب ہے۔ اور جس کو کاٹ دیا وہ
معیوب ہے اور جس پر صاد نہیں وہ بے عیب اور ہموار اور جس کے معنی میں مجھے
تامل ہے اس پر نظر۔ علامت اس کی نظر باقی جا بجا منشاء اصلاح اور حقیقت
الفاظ لکھ دی ہے۔ تین جزو جس میں سات ورق سادے ہیں پہنچتے ہیں اور
اجزا بھیج دیجئے۔ غالب (مکاتیب غالب از امتیاز علی عرشی صفحات ۶۵/۶۶)

رے دل کی ذرا سی پھانس کیا ہے رو برداد سکے
اکھاڑا ایک ہی حملہ میں ہو در جس نے خیبر کا
در تھا

ہوا یوں دین اصحاب رسول اللہ سے شایع

ہوا دیں نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شایع
کہ نکلے چوک میں سے جسطرح بازار چوسر کا

اف ری گرمی تپ عشق کہ جل کر نکلا
رگ سے جب سوختہ جاں کے ترے خنجر نکلا

دل

پھر مجھکو کچھ خبر نہیں آگاہ اے خدا

پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب
تو

نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اُن پر
دیکھنے میں تو ہے اس طرح کی اچھی صورت
طور

شکر کی جائے نہ اک خلق کو مارے ڈالو
خلق کے قتل سے کیا فائدہ بس شکر کرد
کیا قیامت ہوئی گر ہو گئی اچھی صورت

اللہ صبح تک خم گردوں اُلٹ گیا
باقی رہی نہ بوند صبوحی کے واسطے
ساقی نے کس قدر مئے گلگوں پلائی رات

بے خود اور وہ محو خیال رقیب تھے
میں بیخود
تھی وصل میں بھی وہی جدائی تمام رات

قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے
قاتل لگا رکھا ہے تری تیغ کیلئے
تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج
بیتاب کو اگرچہ نہیں سر کی احتیاج

کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اوس نے کی
برہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج
برہم ہے جو

درماں نے تیرے گور میں پہونچا دیا مجھے
اب چارہ گر بتا میں کروں کیا ترا علاج
کہ

عادل ہے تو تو شک نہیں کچھ اس میں اے
ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بنائے چرخ
پہ لیکن

آپ چلکر کہو احوال دل اُم د سے بیتاب
اُوس سے
کس کی دوات قلم کیسی کہاں کا کاغذ
کیا قلم کیسی دوات اور

دشمنوں کا اور فلک کا بھی میں اب مشکور ہوں
ممنون
خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم مرے آزار پر

لکھ دیا لکھتے تو لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا
رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر ۵۴۴

طبع رساں نے اپنی دوبالا کیا اسے
میری
پہنچا تھا مرتبہ کو نہ اپنے سخن ہنوز

آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالبؔ۔

سخت جانی تجھے اللہ کی مار او ظالم
پھر گیا زندہ مجھے دیکھ کے دلبر مایوس
چھوڑ

خدا کرے ترے پیکاں تیر کو تو صنم
ظالم
پسند آئے دل بے قرار کی آغوش

× ہے مرے دوست کا بھی دشمن جاں وہ ظالم
ہیں نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص

یہ شعر غالب نے قلمزد کر دیا اور اس کے نیچے یہ تحریر کیا۔

دوست یعنی معشوق۔ دشمن یعنی رقیب۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے دشمن جاں نہیں ہوتا۔ مانا کہ وہ رقیب معشوق کا درپردہ دشمن ہے۔ پھر اس عاشق نے اپنے معشوق کے عدد سے اخلاص کیوں نکالا۔ خدا جانے اس شعر کے فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا۔ غالبؔ

دوستی اپنی خدا کے لیے کہہ کر رکھئے
تہ
نہیں بھاتا ہے مجھے ناصحو اتنا اخلاص

× قاصد کی تاب کیا ہے کبوتر کی کیا مجال
پہنچا دے یار تک تو ہی پروردگار خط

یہ دونوں مصرعے بھی غالبؔ نے قلمزد کر دیے اور ان کے نیچے تحریر کیا۔ دو گستاخی

بے مزہ ہے ۔ ۱۲۔

بے داد دل وگرنہ یہ دونوں ہیں بد ملا

کرتے ہیں آہ و نالہ ترالے خدالحاظ ہ

اس شعر کے ذیل میں غالب نے یہ عبارت لکھی "وہاں بھی نمک ہے

دیوانہ ہے وہ کون جو دن کو جلائے شمع

خورشید رو کے سامنے کیا کوئی لائے شمع

اس مہروش

پروانہ مجھ کو کہتے ہو تم کیا حیا نہیں

پروانہ مجھ کو کہتے ہو تم کیا حیا نہیں

میں مبتلا ہوں آپکا وہ مبتلائے شمع

دیکھو یہ چھیڑ ہم سے وہ غیروں کے سامنے

کہ

انجان بن کے پوچھتے ہیں ماجرائے داغ

درماں کرے گا دیکھو تو کس کس کا چارہ گر

ہیں زخم و آبلے بھی تو دل پر سوائے داغ

ہے زخم اور آبلہ

وہ بھی تو بھاگ نکلے یقیں ہے مجھے اگر

او لئے وہ

دوڑے مرا گلا تری شمشیر کی طرف

اب پوچھتے ہیں آپ کے ہے تجھ پہ کیا قلق
کو
جب قابل بیان نہ اپنا رہا قلق

اتنا کسی سے وصل میں ہوگا نہ عیش بھی
کو
جتنا کہ تیرے ہجر میں ہم نے سہا قلق

دل کو جگر کو پھونکے ہی دیتا ہے ہائے عشق
اک آگ کاش سینے میں جلتی بجائے عشق
ہوتی

لیا
کیا سختیوں سے جان دی بیتاب نے مگر

دی جان کس عذاب سے بیتاب نے مگر
نکلا نہ شکوہ منھ سے کبھی جز ثنائے عشق

ناچیز اوس کو جان کے یہ نالۂ سحر
اولٹا پھرا کہ جا نہ سکا آسماں تلک
ادھر نہ گیا

کیا ہے کی تو ہی بتا دے محتسب
ہے کدھر
ڈھونڈتے پھرتے ہیں میخانے کو ہم

قیس و فرہاد کا گو عشق میں کچھ نام ہوا
لیک بیتاب کی مانند تو مشہور نہیں
وہ

جھنجلا کے بولے جاں جاں بھی نہیں اب تمہیں عزیز
نہیں کیا
کہ بیٹھے اون کو جان جو اک روز پیار ہیں

بیتاب کا بھی رند و معلوم ہے پتا کچھ
اوس کو بھی دیکھتے تھے اکثر اس انجمن ہیں
ہم اوس کو

شکوہ ہے کیا قبول گر اپنی دعا نہیں
اس درد کی خدا کے یہاں بھی دوا نہیں
بھی گھر ہیں کیا بزم رفتگاں میں خموشی کا رسم ہے
کی کی
ہیں جمع کسقدر پہ کسی کی صدا نہیں

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ لگائی خدا سے ڈر
نکالی
ظالم ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں

لکھتے نہ نامہ میں اب کیوں نہ شوق حسرت وصل
کیوں شوق سجدۂ در دوست
ہم کو اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں

الماس تک نہیں ترے مرہم میں چارہ گر
ہرگز نمک
پھر کیوں میں زخم دل کو عبث بے مزا کردں

ہوا ٹنگ جلوۂ جاناں سے وہ بھی
وہ بھی انگشت نماؔ ہے
گیا ماہ نے ٹکڑے کتاں کو

مسیحائی نہ دیکھی ہو تو میرے
گرادس کی
جنازہ پر لے آؤ دلربا کو
مری تربت پہ لاؤ

بھا گیا اپنے قتل کا ایما ہم کو
بعد مردن بھی تھی مرنے کی تمنا ہم کو
ہے
عشق نے دم ہی پہ بیتاب بنا دی آخر
کسی صورت سے بھی کافر نے چھوڑا ہم کو
ستمگر

ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر سودے سے
وحشت
جبکہ اللہ نے پیدا کیا ننگا مجھ کو۔

دیکھا جس بت کو لگے پڑھنے اسی کا کلمہ
میرے خالق نے دیا ہے عجب ایماں کو

ہزار صبر کرو لاکھ بے قرار بنو
کسی سے پوچھو تو اپنا ہی وہ مزار نہو
کہیں یہ حضرت بیتاب کا

بہلتے ہیں دو دریا بہا بیٹھ چشم تر دونو فغاں و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونو

اس شعر کے نیچے غالب نے یہ عبارت لکھی اور آخر میں لہ علامت بنائی۔ دونوں میں نون ضرور چاہیے اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھ دو۔ لہ

کیوں کہ منہ رکھے وہ میرے سینۂ پر داغ پر

بوی گل سے خاطر نازک پہ جسکی بار ہو

بھی

حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو رونق مگر

با وفا کیوں کر بناتے اس کو تم لاچار ہو

(لاچار غلط محض ہے۔ ناچار پہ نون صحیح ہے

اوازادس کاشن کے شب وصل مرگئے گویا ہماری موت بھی مرغ سحر کے ہاتھ

گی

خانۂ آئینۂ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی دیکھ رکھ دیتا ہے جب وہ مہ شمائل آئینہ

کر رکھتا

مجموعہ کا ساعطر ہے اوس کا سینہ بوی بدن ملی ہے جو بوی مد کے ساتھ

کے گلے کا ہار

جاں کنی ہی ہووے ابتک آس توٹوٹی نہیں

پر کر

حشر میں ہووے گی اس سے ایک صحبت اور بھی

گریہ و زاری کو جو روکا تو سودا ہوگیا ہو گئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

(میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا "جو روکا" یہ لفظ مکروہ تھا جو کی جگہ جب لکھ دیجئے شعر صاف اور بے عیب ہو جاوے گا۔ غالب

قتل میں اپنے خدا اب کون سی تاخیر ہے خم یہاں گردن علم دیاں ہاتھ میں شمشیر ہے

کس لئے

واں

ہے غزلخواں بلبل کہتے ہیں وہ برگِ گل
پر ہمارے سامنے تو غنچہ تصویر ہے

غالب کا ایک خط بنام سید محمد عباس علی صاحب بہادر بیتاب اوپر دیا جا چکا ہے اور اس کے ہمراہ بیتاب کے اشعار پر اصلاح ۔ غالب نے جن مصرعوں یا اشعار کو قلمزد کر دیا ہے جو الفاظ اور اشعار میں کاٹ کر ان کی جگہ متبادل یا موزوں الفاظ کی نشست کر دی ہے وہ سابقہ اوراق میں اور ذیل میں بجائے قلمزد کرنے کے ان کے نیچے لکیر کھینچ کر عبارت الفاظ جس طرح اصلاحی نشست میں تھے درج کر دیئے گئے ہیں ۔ صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں نواب فردوس مکاں نواب سید یوسف علی خاں کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب خلد آشیاں نواب سید کلب علی خاں بہادر سابق والیان رامپور کے حقیقی ماموں تھے ۔ امیر مینائی ان کے باب میں فرماتے ہیں کہ ۔ یہ صاحبزادے مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں بہت ممتاز ہم چشموں

میں خوش فکری کی بدولت سرفراز ہیں۔ چھیاسٹھ برس کی عمر ہے (انتخاب یادگار صفحہ ۷۶) اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۲۲۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے اپنا کلام دیوان جو مومن خاں مومن مرحوم کے اصلاحی کلام پر مشتمل تھا غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا تھا۔ اور اس کے بعد بھی بذریعہ مراسلات برابر اصلاح لیتے رہے۔

دیوان مذکور کتاب خانہ ریاست رام پور کے ردی گھر میں پڑا تھا جسے ناظم اعلیٰ کتاب خانۂ ریاست ہذا علامہ امتیاز علی خاں عرشی مدظلہٗ نے دستیاب کیا۔ بیتاب کے دیوان کا پہلا ورق دست برد میں ضایع ہو چکا ہے۔

لالہ سری رام مؤلف خمخانہ جاوید تحریر کرتے ہیں کہ ۱۸۳۷ء میں کئی برس سے دلی میں رہتے تھے نہایت پاکیزہ سرشت اور خوش مقال کمالات ظاہری باطنی سے مزین تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے اشعار خوب کہتے تھے بیتاب ۲۹ رجب المرجب ۱۳۰۰ء مطابق ۶ جون ۱۸۸۴ء دوپہر کے وقت فوت ہوئے۔ ان کا دیوان "گلدستۂ باغ جناں" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ کتب خانہ رام پور میں مطبوعہ نسخہ کے علاوہ تین قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔ (مکاتیب غالب صفحات ۱۰۷/۱۰۸)

قبلہ قصاید و غزلیات و رباعیات کو بہ قدر اپنی فہم و فراست کے درست کر کے خدمت میں گذارتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبرآباد نہیں گئے اس لفافہ کو آپ کے پاس رامپور کے پتے سے بھیجتا ہوں توقع یہ کہ مجھ کو اپنا خادم سمجھیے اور جو خدمت میرے لایق ہو بے تکلف ارشاد کیجیے

راقم اسد اللہ خاں مرقومہ ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء

اک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا اے اجل   سُنتے ہیں کچھ وہاں بھی اپنے قتل کی تدبیر ہے

ہمارے

۵ قتل کرتے ہیں گمان دادخواہی پر ہمیں — دیکھ تو تفسیر سے پہلے یہاں تقدیر ہے

ہمنشیں

گذری اپنی عمر تو کس چین سے شکر خدا — دیکھئے بیتاب اب کیا خواہش تقدیر ہے

اب تک عمر اپنی

فرماتے ہیں بالیں پہ وہ بیمار کے اپنے — کیا درد ہے؟ کیوں اسکا مداوا نہیں کرتے

آ کر

ہمیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے — اور تم سر اٹھاؤ گھر بیٹھے

آپ باتیں بنائیں

اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام — نوحے کرنے کو چارہ گر بیٹھے

نوحہ

وفادار ناصح مبارک ہوں تم کو — ہمیں تو وہی بے وفا چاہیے

تمہیں

مقابل میں تیرے تو اے پند فرما — تجھی سا کوئی بے وفا چاہیے

گو

خدا نے دیا ہے عجب دل یہ ہم کو — اب ایسا ہی اک دلربا چاہیے

ہمیں

بجا ہیں تمہارے سب ارشاد لیکن — اذرا اور کی بھی سُنا چاہیے

پر

زباں پر نام اوس کا دمبدم ناصح جو آتا ہے
خدا کے واسطے چپ رہ کلیجہ منھ کو آتا ہے

نیاز و ناز میں ہے ربط گر ضد ہے تو ظاہر ہیں
میں پڑھتا ہوں درود اس پر وہ صلواتیں سناتا ہے
درود اس پر پڑھوں میں اور

ص خموشی سے مری اللہ کیا مسرور ہے دل میں
کہے جا ناصح ناداں مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

اس پر غالب نے ص بنایا مگر اس کے ذیل میں ایک شعر خود کہہ کر لکھ دیا۔

(مطلع) غنیمت ہے کہ نام اوس کا زباں پر تیری آتا ہے
کہے جا ناصح مشفق مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

کشادہ زلف کا دست عدو سے وہم آفت ہے
بکھرنا
غش آیا جب ہوا سے نکہت مشک تتار آئی

تسلی بخش ہوگی سادگی حوروں کی اے واعظ
کیا ہوگی
ہمیں جب یاد یہ آرائش روی نگار آئی

مل گئے خاک میں لڑتے ہی ترے بن گئی جی پہ بگڑتے ہی ترے
ہم ملے

خدا کو تو پاتے ہیں عشق بتاں سے میں وصل صنم مانگتا ہوں خدا سے
یہ میں ہوں

اگر چشم بد ہے تو کچھ زلف کم ہے یہ سچ ہے بچائے خدا ہر بلا سے
کیا

پاس رکھنے کا جو بیتاب وہ وعدہ کرلے صحبت غیر بھی واللہ گوارا ہو جائے
کریں وہ وعدہ ناچار

کیا کہے جاتے ہو کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ   کچھ تو عقبیٰ میں تو ناصح رہے کام آنے سے
آپ

کروں کیا جان سے تنگ آکر دعا کی   بتو منت ہی کروائی خدا کی
کریں کیا مرگ کی آخر

ڈرانا تھا کہ ہم اسکا دل دکھانا   خدنگ آہ نے ہے ہے خطا کی
نہ

گئے وہ تو ہوا ہم کو بتا کے   خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی
کر

عیادت سے بڑی خواہش مرض کی   ہمارے درد کی اچھی دوا کی
عیادت سے مرض کا ہوگیا ذوق

نہ ہنسیے قیس کی دیوانگی پر   خبر تو لیجئے اب مبتلا کی
نہ دو لیلےٰ کو تم مجنوں کا طعنہ   جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی
*زلف بکھری جو رخ یار پہ یاں دل بکھرا   خود پریشاں ہوئے ہم اسکو پریشاں کر کے
(یہ دونوں مصرعے غالب نے کاٹ دیے اور یہ عبارت لکھ دی ۔" زلف خود بخود بکھرتی ۔ ہم نے کب پریشان کیا جو آپ کہیں ںص

آہ جس طرح ہوئے سب عاشق   وہی اپنی بھی حقیقت ہوگی
جسطرح آہ

اس کے نیچے غالب نے لکھا ۔ طَرح اور ہے ۔ فقیر " طرح " بہ حرکت کے معنی میں طرح بہ سکون نہیں لکھتا ۔ ںص

دیکھ ایمان سے کہہ دے واعظ   ایسی ہی حوروں کی صورت ہوگی
اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے ؎

بوسہ لیتے ہی پھر آجائے گی جان کیا بوسہ کی قیمت ہوگی

بے قراری سے مرا ہے ہے کوئی اللہ سے مانگ لائے ایک ذرا صبر اپنے نام سے

اوپر کے شعر کا مصرع اولیٰ غالبؔ نے کاٹ دیا اور مصرع ثانی میں لائے اور اپنے کاٹ دیا مگر ان کی جگہ متبادل اصلاحی الفاظ کوئی نہیں رکھے بلکہ مندرجہ ذیل شعر کہہ دیا ؎

حضرت ایوب گر جیتے ہوں نوائے ہمدمو
مانگ لاؤ اک ذرا سا صبر میرے نام سے

؎

حشر میں اللہ کے آگے یوں ہی لے جاؤں گا
کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

اس شعر پر غالبؔ نے کوئی اصلاح نہیں دی، ذیل میں فقط اتنا لکھ دیا "مجھ سے یہ مصرعہ پڑھا نہیں گیا۔" ؎

تو دیے جا گالیاں دلبر گے ہم بھی کچھ جواب
ہوش میں آئے کبھی تو لذت دشنام سے
آجائیں گے جب

تھا زبس شوق طپیدن پر ادب مانع ہوا

بچ گئے ہم ذبح کے بھی وقت اس الزام سے

دہر دیکھا میکدہ دیکھا حرم بھی دیکھ لیں
آج آنکلیں ہیں یہاں بھی گردش ایام سے
ہم

ذکر اوسی کا ہے کچھ فرماتے   کاش ناصح ہی دل کو بہلائے
ہو

پھر بلائیں بھپنسا دیا کس نے   دی صدا نعش پر کہ وہ آئے
خواب خوش سے جگا

جواب ان کا ہوا گلہ اُلٹا   کر کے شکوہ بھی اُن سے پچھتائے
اور   پچتائے

مارے خدا کہ چھوڑے یہ ایمان کی تو یہ ہے
اُلفت بتوں سے اپنے تئیں لاکلام ہے

اس بیت کو قلمزد کر کے لکھا ہے "کو کی جگہ" تئیں نہ لکھا کرو۔ لص

جبروت یہ نہیں ہے نہ لاہوت زاہدہ   یہ عشق ہے کچھ اور ہی اس کا مقام ہے
اس شعر کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔" لاہوت ہے نہ یہ جبروت اے خدا پرست۔ جبروت بہ حرکت موحدہ اور ملکوت بحرکت لام صحیح ہے ۱۲

پاکر نجات نزع سے آرام کرتے ہیں   ہم رہرو فنا ہیں یہ غربت کی شام ہے
سوتے ہیں بے خبر

ص معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ   ساقی اگر نہیں تو نہو مے سے کام ہے ص
ص بیتاب پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ   یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے ص

ان دونوں اشعار کے دونوں طرف صاد بنا کے دائیں گوشہ میں لکھتے ہیں واللہ کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب ۱۲، پھر بائیں گوشہ میں لکھتے ہیں "خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشہ میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزہ میں ہی جانتا ہوں۔ غالب

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کریں گے   آزار تو دینے کو کبھی یاد کریں گے
 ہر روز کئی بار مجھے

پرواز کی ہے گرچہ ہوس دلمیں مگر ہم آزردہ نہ خاطر تری صیاد کریں گے
طاقت ابھی موجود ہے لیکن ہم خاطر
اسی طرح مریں گے کہ ہو ہر ایک کو عبرت معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے
اس دُکھ سے

× خدا کے آگے ہمیں پوچھے جائیں گے پہلے
مری وفور ضلالت ہی رہنما ہوگی

یہ شعر قلمزد کر دیا اور لکھا "پوچھنا اور ہے پرسیدن کا ترجمہ پوچھنا بے نون کے ہے۔ یہ آگہی کے واسطے لکھا ہے شعر غلطی املا کے واسطے نہیں کاٹا بلکہ ناقص تھا۔ رلص

× فلک بہائے گا آنکھوں کی راہ اس کو بھی
جو جو خون دل ترے غم میں مری غذا ہوگی

اس کے ذیل میں غالب نے لکھا "خون مذکر۔ غذا البتہ مونث ہے۔ مگر ذرا غور کیجئے خون غذا ہوگا یا خون غذا ہوگی رلص۔ یہ لکھ کر شعر کاٹ دیا

نہیں ٹھہرا ہے ابتک عرش اعظم دعا کی تھی یہ کس نے بلبلا کے
ہے

بن اس کے خون جگر ہم پییں یہ ساقی خدا کرے ترے ساغر میں بھی لہو ہو جائے

ع : " خدا کرے کہ ترے جام میں لہو ہو جائے "۔ اس شعر پر صاد بنا کر حاشیہ پر لکھا کہ شعر اچھا ہے۔ مگر بھی کا لفظ بے موقع اور بے محل ہے مصرع ثانی میں ساغر اور بھی قلمزد کر دیا ہے۔ ان الفاظ کی جگہ متبادل لفظیں نہیں رکھیں بلکہ پورا مصرع بدل کر لکھ دیا جو شعر کے نیچے درج کر دیا گیا ہے۔

ہوئے ہیں گرچہ تائب پر ہوا وابر و باراں میں
ہوائی

رہے نے ساقیا میخانہ میں تیار تھوڑی سی

میں سب سمجھے ہوتے ہوں بات کا جو ڈھب تمہارا ہے
نہ چاہوں ناصحا میں اسکو یہ مطلب تمہارا ہے
ناصحو

کہاں ہیں قیس اور فرہاد اب یہ عہد ہے اپنا
دور
کہاں ہے لیلیٰ و شیریں زمانہ اب تمہارا ہے

مژگاں سے تیری صد یہ کس طرح سے ہو دل
ہو کس طرح سے دل
اس تیر کے لئے بھی تو نخچیر چاہیئے

نیکوں کے کبھی جھکے رہیں سر کچھ تو دہر کی
مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے

اس شعر پر کچھ اصلاح نہیں بلکہ فقط اتنا لکھ کر رہنے دیا "یہ مصرعہ مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔" معلوم نہیں یہ جملہ مصرع اولیٰ کے لیے تھا یا ثانی کے لئے کوئی مطلب واضح نہ ہو سکا۔ مرتب)

بلا میں آپ پڑتا ہے تو ناصح ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے
تو پڑتا ہے
خدا کیونکر ملائے دل ربا سے نہ کہتے دو کہ یہ قدرت نہیں ہے
معاذ اللہ
یہی کہہ کہہ کے ٹالو حق شناسو کرے جو چاہے پر عادت نہیں ہے
بہلاتا ہوں دل کو

ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو تمہارے آگے گو غیرت نہیں ہے

عزت

آج پیغام پر نہ کچھ کہنا ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے

وہ ہم پر بہت

مصرع ثانی پر اصلاح دیدی ساتھ ہی نیچے یہ عبارت قلم بند فرمائی کہ "ہیں وہ ہم پر بہت" جہاں پورا لفظ آسکے یعنی پر وہاں ادھورا لفظ پہ کیوں لکھیے البتہ جہاں گنجائش نہ ہو وہاں قاعدہ کے موافق جائز ہے اور اس قاعدے کا نام تخفیف ہے" ۔ص

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب تم بھی اب بن کے پارسا بیٹھے

آپ بھی

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے
کوئی ہے میرے سوا جو کہ مقابل آئے

کون

کیوں یک بیک زمانہ کا نقشہ بدل گیا

ناگاہ کیوں

یہ رنگ تو دنیا نہ تھا دنیا میں آشکار

؁ تنز میں کچھ آج کل ہے وہ اس خاکدان کی
خلد بریں بھی رو برو ہے جس کے شرمسار

اس شعر کا مصرعہ اولیٰ قلم زد کر دیا اور مصرع ثانی میں "وہ ہے" کاٹ دیا مگر کچھ اصلاح نہیں دی فقط اتنا لکھ کر اکتفا کی کہ "یہ مصرعہ مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ مصرعہ ثانی کے نیچے لکھا "رد جبکے ہے" مگر بعد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی قلمزد کر دیا ہے۔

گُل نے کیا ہے شاخ کے ہر جز سے سر بدہ
ظہور
اب کون سی جگہ ہے کہ نکلے جہاں سے خار

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزم نشاط میں
ہاں ایک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بے قرار
اک نسیم

کثرت سے بسکہ جمع ہوئے شاہدان گل
کس کس مزے سے ہوئے آپس میں ہمکنار
ہوتے ہیں

دن عید ہے زمانہ میں اور رات شب برات
شب
ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار

وہ دن ہے آج جس پہ کروں جان تک نثار
خدا
ہے جشن غسل صحت نواب نامدار
"جاں تک فدا،، اگر یہ مطلع ہے دو تو چاہئے اس سے قبل ایک شعر میں اطلاع دی جائے جائے۔

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صنعت
ثنا
بیتاب اب دعا ہی پہ بہتر ہے اختصار

بات یہ ہے وقت پر خوب سجا ہی مجھے

فکرِ رسا کا بڑا مجھ پہ یہ احساں ہوا
نطق

دھوم سے سرکار میں جشن کا ساماں ہوا

دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہے آج
عیش سے لے فرش تک عیش کا طغیاں ہوا

رنگ محل کا سماں ہو نہیں سکتا بیاں
جس کی نظر پڑ گئی ششدر و حیراں ہوا
والہ

کثرتِ تعیش سے مثلِ جبینِ عروس
روی زمیں پر عجب طرح کا افشاں ہوا
طرز

بزم منور ہوئی مقدمِ نواب سے
جبکہ وہ رونق فزا جومہ کنعاں ہوا
ع: "جب سے کہ رونق فضا وہ مہ کنعاں ہوا" الخ جوں بہ معنی مثل و مانند اب متروک ہے۔ غالب۔

دور میں اس کے بجز ابر نہ رویا کوئی
اور جرس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا
بجز رعد کے

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ تا آں ہوا
ویسا ہی اس قوم میں کلب علی خاں ہوا

ہو رہی ہے عجائب آراستگی کہنہ سرا
سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوئے ہیں مامور

نہ کھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل
اک طرف ہاتھ میں رکھتے ہیں سرافیل بھی صور
سے

قبض ارواح سے معذور ہوئے عزرائیل
مدت کا غم ہی کسی کو نہیں سب ہیں مسرور
کی فکر

زیب و زینت کا اب اس میں کیا کہنا ہے
صانع گل کی جو تعلیم ملائک کا شعور
صانع گل کی جو تعلیم ملائک کا شعور
تو

چاندنی رات کا تو ذکر ہی کیا صل علیٰ
کیا ذکر ہے اللہ اللہ
لیلۃ القدر پہ فائق ہے شب تار کا نور

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کہ دیں کسکو زکوٰۃ
تھے جو محتاج جہاں میں وہی ہیں ذی مقدور
وہ ایسے ہوئے

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا
بادشاہوں کے یہاں بھی تو نہ تھا یہ دستور
بادشاہان جہاں کا نہ تھا

اسقدر کھانے کی افراط ہے اور پانی کا قحط
دیکھو جس چاہ کو شربت سے ہے منھ تک معمور
ہے قند سے

کس سلیقے سے ہے آراستگی ہر ہر شے کی
مہتمم بزم کے آج اپنا دکھاتے ہیں شعور

تھاپ طبلوں پہ پڑی آئے پریوں کے جھمگھٹ
پریوں کے آئے
شادیانے کی صدا پہنچی فلک سے بھی دور

× چلی اس طرح سواری کہ نہ دیکھی نہ سُنی
رشک کھانے لگے مرقد میں امیر طیمور

شعر قلمزد کر دیا پھر یہ عبارت۔ یہ لفظ طوی سے نہیں تے سے ہے۔ اور پھر طیمور بوزن طنبور نہیں۔ دراصل تمر بوزن ثمر ہے لکھتے ہیں تیمور اور پڑھتے ہیں تمر ۔ اور تمر ترکی میں فولاد کو کہتے ہیں الخ
لنگیں تماش تمامی کی ہیں باندھے ستے
ہیں ہر اسے چڑھے اور عطر سے مشکیں معمور

کرد ایں فخر قصائد چو رقم خامۂ من
وجد کردند چہ خاقانی و عرفی در گور
"خاتمۂ قصیدۂ ہندی یہ شعر فارسی خصوصاً وقتے کہ لفظ گور قافیہ باشد مناسب نیست" الخ
للہ الحمد کہ اب چرخ ہوا نیک خصال
ترک اس نے کیے وہ اپنے قدیمی افعال
اپنے وہ

راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل وگہر
خذف وسنگ سے بے قدر ہیں دنیار ویال

خزف بہ معنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی زے سے ہے۔غالب

ہے کسی جا یہ بھگت رلیس کہیں سانگ کہیں
رہس
کہیں کھچن کہیں کتھک ہیں کہیں ہیں قوال

کوئی باعث بھی تو ایسا ہی قوی ہے ورنہ
اس کی عادت سے تو یہ بات بھی از بس ہی محال
البتہ

اپنے اسرار سے واقف ہے تو ئی اے پر فن
آگاہ ہے تو
بھید تیرے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال
کس کی ہے

بن پڑے صانع قدرت سے بھی دو ایک نقشہ
دو ہی نقشے
کھینچتا اور بھی کچھ سکیں گر ایسی اشکال
کھنچ

اور شجاعت کا یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو اب
دیکھ لیں حضرت رستم اگر اوس کی تمثال
دیکھ لے رستم و دستاں

ہو یہ حیرت میں یہیں تھا کہ زمیں پر اللہ
کہ میں یاں تھا کہ زمیں پر یارب
عرش کی سیر کا راکب کو گرا جائے خیال

۲ وعدہ کے ساتھ اک جز لاینفک ہے
عہد کا نقص ہوا عہد میں اسکے ہے محال
"جز لاینفک غلط، جزو لاینفک صحیح" شعر قلم زد کر دیا۔

بھوکے پیاسوں کے خور و نوش کے کیوں آتے نہ دن
یہ مسلّم ہے کہ بعد رمضاں ہے شوال
بعد از رمضاں

فلک پر کوئی اُڑ جائے یہ وہ ہی
آخر
نصیبوں میں سوا دو گز زمیں ہے

یہ سچ تحسین کے قابل ہیں معشوق
مگر عشاق پر بھی آفریں ہے
گو

جناب غالب دوراں کا بیتاب
کلام حضرت غالب
خلوص طبع سے اب خوشہ چیں ہے

غالب دوراں لفظ نامانوس ہے،، لص
ایدل تو اسکو دیکھ کے ایسا بھسل گیا
حیراں ہوں میں کہ پہلو سے کیونکر نکل گیا
سینہ

دل پر بنی ہوئی تھی اجل کے نہ آنے سے
اب جاں پہ آبنی تو ذرا دل سنبھل گیا
جو

کیسا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی تو ٹھہر جا
ٹھہر تو جا
تقریریں کرکے روز یہ ناصح تو ہل گیا

پھاہا ہے وہ تیزاب کا کیوں ہوتے ہو برہم
ہم نے دل پر داغ پر رکھا ہے جو مرہم
نہیں

کہوں کیا یوں بتانے کی نہیں ہے
وہ بات ایسی چھپانے کی
رقیبوں کے سنانے کی نہیں ہے
یہ غیروں

تمہیں سچ باور آنے کی نہیں ہے
نہ کہہ مجھ سے میری لے بلائیں
پر الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے
میری الفت

وہاں رقیبوں سے گرم صحبت یہاں امید وفائی وعدہ
ہے ایک طرفہ ہی یہ تماشہ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش
یہ طرفہ تر

محبت تری نفرت اوس کی بڑھی یہ کیسا پڑا اب دل زار پیچ
آنے

مسرور ہوں اغیار خدا کی قدرت — اون سے ہونا پیار خدا کی قدرت
اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم — ہم شکل گنہ گار خدا کی قدرت
چپکے — مثل

غافل نہ کر اپنی زندگی کو تو خراب — دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثلِ سراب
زندگانی
آنکھیں کھل جایئں گی جب آنکھیں ہوئی بند
بیداری کا عالم یہ نظر آئے گا خواب

یا الٰہی یونہی وہ برسرِ بیداد رہے
مر چکے ہم تو نہ غیروں کی بھی بنیاد رہے
مٹ چکے

اوس کے مظلومین پہ رحم آئے نہ کیونکر بیتاب
قتل کے بعد بھی خوش جیسے نہ جلّاد رہے
جن سے

دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے
ہم جو کل دیکھنے
سب بیکار اوٹھے کہ لو مُرشدِ کامل آئے

"جو ہم عشاق" میں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔
بدنصیبوں کی ذرا وصل کی خوبی دیکھو
شب
کہ وہ آئے بھی تو اغیار کے شامل آئے

متفرقات

چند شعر

مہرباں ہو کہ بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اس غزل سے متعلق مولانا امتیاز علی عرشی ناظم اعلیٰ رضا لائبریری رامپور نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

جناب حامد حسن قادری نے نہایت دلچسپ اطلاع بہم پہنچائی ہے، اپنے مکتوب بنام حسرت شملوی میں رقمطراز ہیں۔ میرے پاس بزرگوں کے وقت کا دیوان غالب ہے اس میں میرے والد مرحوم کے قلم سے یہ دو شعر لکھے ہیں۔

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہو کہ بجھا بھی نہ سکوں

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباں گڑھ مکٹیشری غالب کے زمانے کے ایک بزرگ تھے اغلب ہے کہ غالب نے دیوان شائع ہو جانے کے بعد مندرجہ بالا اشعار کہے ہوں اور انھیں شامل دیوان نہ کیا جا سکا ہو۔

شعر ۔ قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد مؤلف آب حیات لکھتے ہیں کہ غالب مہاجنوں کے قرضدار ہو گئے، ادائیگی کی کوئی صورت نہ بنی تو عاجز آکر مہاجنوں نے ان پر نالش کر دی غالب جواب دہی کے لیے عدالت میں طلب کیے گئے، مفتی صدر الدین آزردہ کی عدالت میں پیشی تھی غالب جب حاضر عدالت ہوئے تو یہ شعر پڑھا...... حاکم عدالت نے مدعیان کو روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر کے مقدمات فیصل کر دیے اور اس طرح غالب قرض کی گراں باری سے سبکدوش ہو گئے۔

(مرقع غالب صفحہ ۶۶)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

نار بمعنی آتش دوزخ، التہاب، شعلوں کا بھڑکنا۔ محبوب کی بدخوئی بھی میرے لیے سامان راحت ہے۔ اگر میں ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں دوزخ کی آگ بھی شعلہ زنی اور بھڑکنے میں اس کی خو سے مشابہت رکھتی ہے اس لیے میرے واسطے سامان راحت ہے عشق کا ایمان یہی ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شعر پیچیدہ نہیں۔ سیدھا سادا ہے، مطلب یہ ہے کہ معشوق کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف، نگاہ کا چرانا ایک طرف، اسی طرح مصرعۂ ثانی میں لاکھوں لگاوٹیں

ایک طرف غصہ میں بگڑنا ایک طرف دونوں مصرعے ہم پلہ اور اپنا آپ جواب ہیں بلکہ بے مثل ہیں۔ عاشق و معشوق کے مابین ہمیشہ ایسا ہی پیش آیا کرتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ عاشق کی نظر میں آنکھ دکھانا لگاوٹ سے بھی زیادہ دلفریب ہے اسی طرح معشوق بناؤ سنگار میں نہایت دیدہ زیب و دلفریب معلوم ہوتا ہے مگر اس کا غصہ سے بگڑنا اس کے بناؤ سے زیادہ جاذب ہوتا ہے۔

مفتی آزردہ، کہ کلام کی سادگی و پرکاری پر والہ و شیدا ہو جایا کرتے تھے غالب کی پیچیدہ گوئی پر ہمیشہ سے حرف گیر تھے اس شعر کو سن کر بہت مسرور ہوئے مگر مذاقاً بولے۔ یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اس میں مرزا کی کون سی خوبی ہوئی۔

(مرقع غالب ۷۰)

شعر؎ وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

غالب نے ایک خط شاہ عالم مارہروی کو تحریر کیا:

مشفقی، مکرمی چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہیے گا اور یہ پیام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کہنا یہ اس سے ہے کہ ہر کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ ع

خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں

مصرعۂ ثانی خفیف ترمیم کیساتھ تحریر کیا۔

(مرقع غالب ۷۲)

شعر۔ کیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام

"غالب کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا جسے رسالہ زمانہ کانپور نے جولائی ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں نقل کیا۔ قصیدہ مذکور کا یہ انیسواں شعر ہے جس میں ریل کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتہ سے رانی گنج تک جو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے جاری ہوئی تھی تعمیر کا کام برابر دلی تک لے جانے کے لیے جاری رہا پہلے آگرہ سے جمنا کے غربی ساحل کے ہمدوش داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے بعد ٹونڈلہ جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی دریائے جمنا کے مشرقی کنارے جولائی تک ۱۸۶۴ء میں کھولی گئی انھیں ایام میں جمنا کا پل بھی زیر تعمیر تھا ۱۸۶۶ء میں پل مکمل ہوا یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار ریل اس پر ہو کر گزری۔

لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب جو میرے چچا تھے۔ غالب سے پہلی ملاقات کا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ "جب ہم گوڑگانوے میں ہیڈ ماسٹر تھے وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر کو وان کے تبادلہ کا موقع پیش آیا۔ صاحب موصوف ہمارے حال پر نظر عنایت خاص فرماتے تھے ان کی مفارقت کے سلسلے میں جو جلسہ قرار پایا اس میں لوگوں کی رائے ہوئی کہ کوئی چیز بطور یادگار نذر دینی چاہیے چنانچہ کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کی رائے سے نقرئی قلمدان دینا تجویز ہوا۔ قلمدان پر کوئی شعر بھی کندہ کرانا قرار پایا اس سلسلے میں آشوب غالب کے پاس گئے۔ یہ تھی ان کی پہلی ملاقات جس کے بعد دونوں کے باہمی روابط اس درجہ بڑھ گئے کہ غالب آشوب کو فرزندا رجمند لکھا کرتے تھے۔ غالب نے قلمدان کے لیے جو قطعہ لکھا وہ درج

ذیل ہے ؎

گوڑگانوے میں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی
سو یہ نظر فریب قلمدان نذر ہے (خمخانۂ جاوید)
مسٹر کوواں صاحب عالی وقار ہے مرقع غالب[۸۲])

شعر ؎ ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

کسی موقعہ پر خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی خصوصیت پر دربار میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ غالب موجود تھے اسی وقت یہ شعر کہا۔

(مرقع غالب ۱۸۸)

؎ دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

یہ شعر انتقال سے قبل اکثر غالب کے وردِ زبان رہتا تھا۔

(مرقع غالب ۱۸۹)

؎ ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے
فراز مسند عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشہ ہوا برات کی رات
کہ آسمان پہ کواکب نے تماشائی

.... جبکہ سیّد غلام بابا نے — مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات — کہ کواکب ہوئے تماشائی

یہ دونوں قطعات مرزا غالب نے بہ تقریب شادی سیّد غلام بابا رئیس سورت لکھے تھے مگر تاریخ نکاح نہ لکھنے کا عذر انھیں تحریر کیا۔

"وہ دوست جو مادہ ڈھونڈھ لیتے تھے وہ جنت کو سدھارے۔ معذور ہوں اور مجبور ہوں"

(مرقع غالب ۱۸۹)

ے درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

ایک دن نواب زین العابدین خان عارف مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب حسین علی خان کھیلتے ہوئے آئے۔ کہا دادا جان شیرینی منگا دیجیے اور پیسوں کی تلاش میں غالب کی صندوقچی کھول کر ٹٹولنے لگے۔ اسی ساعت غالب نے یہ شعر پڑھا۔

(مرقع غالب ۱۹۰)

ے سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

یہ شعر مرزا غالب نے ایک خط میں صغیر بلگرامی کو لکھا تھا۔ جوابی اشعار یہ ہیں ے

سنا صغیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین[۱] کی ہے دعا — خدا کرے مرزا غالب جئے ہزار برس

۱؎ قاعدہ ابجد کے حساب سے "غ" کے ایک ہزار اعداد ہوتے ہیں۔ (مرتب)

۵ جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخئے میں ٹانکوں سے سوا ہیں

یہ شعر[1] غالب نے قید خانہ میں اس وقت فی البدیہہ کہا تھا جب ایک دن سول سرجن دلی مسٹر راس بغرض معائنہ گئے تھے اور معائنہ کرتے وقت غالب کے پاس پہنچ کر ان کا حال دریافت کیا تھا غالب کا مذکورہ شعر ان کے دیوان اردو میں موجود نہیں۔ اس تاریخی شعر کے ساتھ جو واقعات متعلق ہیں وہ یوں ہیں کہ غالب سے فیض الحسن کوتوال دلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی جس نے انھیں بہ علت قماربازی قید کرا دیا۔ اس واقعۂ قید کی تاریخ عاصی دہلوی (متوفی ۱۸۶۵ء) نے بصورت قطعہ نکالی تھی۔ تاریخ کی یہ خوبی ہے کہ اس کے مصرعوں سے بیک وقت ہجری عیسوی، فصلی، بکرمی چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ غالب کی تاریخ قید میں تضاد ہے مولانا حالی نے یادگار غالب میں اس کی بابت ۱۲۶۴ھ لکھا ہے جبکہ مولانا مہر نے ۳۱ راگست ۱۸۴۷ء تحریر فرمایا ہے۔ ان دعووں کی تردید مندرجۂ ذیل قطعہ سے ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں یہ واقعہ کا تذکرہ یہاں مقصود ہے ورنہ غالب کی شان میں گستاخی یا ان کی کسی طور پر تذلیل مراد نہیں۔ کہتے ہیں بروقت گرفتاری کوتوال رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گیا اور ظاہر کیا کہ زنانی سواریاں آئی ہیں اس فریب سے اندر داخل ہو گیا اور وہاں ضربات جوتی اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی زینہ کے اندر جمعیت بہت تھی کچھ امدادی بہ قدر پہنچ گئے گرفتار کر کے غالب کو قید کرا دیا گیا بہت سے رئیس اور شرفا اس نازیبا حرکت سے برہم و ناراض ہوئے عدالت میں برات کے لیے مساعی ہوئے مقدمہ چلا اور قید ہو ہی گئی۔ عاصی

---

[1] مکاتیب غالب امتیاز علی عرشی $\frac{65}{66}$

لکھا ہے ؎

سرا بجد سے فصلی میں تو سب "اظہار طوفاں" ہے
۱۲ھ
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید غریباں ہے

"قلق غالب"، نہ کیونکر موش اور گربہ کے دلپر ہو
۱۲۶۳ھ
دبی تبی کٹاتی کان چوہوں سے بہ زنداں ہے

رہائی روز بد سے میرزا نوشہ کی کیونکر ہو
"زن غم خوار" بن کر داں گیا فیض الحسن خاں ہے
۱۹۰۴ بکرامی
سر بازو پکڑ کر خمخمۂ تقدیر نے عاصی
اسد کو جوتیوں سے گھیر کر ڈالا بہ زنداں ہے
۱۸۴۷ء

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار نکلیں گے۔ مولانا صدر الدین آزردہ جو غالب کے طرز کو نام رکھتے تھے اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ اس شعر کی ایک اور خوبی کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی ایک یہ کہ پاسبان نے سائل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ سائل پاسبان سے کیا چاہتا تھا سو پر دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں۔ پہلی بات پر لفظ شامت پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے علاوہ بر ایں روزمرہ کی نشست اور

الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت قابل تعریف ہیں۔

(یادگارِ غالب)

مطلع

۵ اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں اندازِ بیاں رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے غلط نامہ میں اس شعر سے پہلے دو مزید اشعار بہم پہنچائے ہیں جو ان کو جناب وحید الدین نظامی بدایونی کے مملوکہ مخطوطہ میں سے ملے ہیں۔ چنانچہ یہ دو شعر شامل کر دیے ہیں۔ اگر یہ اشعار غالب کے مانے جائیں گے تو گویا کہ انھوں نے تین اشعار میں اپنی ساری زندگی کی تلخی پیش کر دی ہے۔ انھیں اس کا تو شدید احساس تھا کہ ان کے سرمایۂ حیات کا کوئی صحیح قدر داں نہیں ملا۔ نہ ہی کسی نے اس کی حقیقت کو پہچانا لہٰذا لکھ لکھ کر جمع کرتے رہے حتیٰ کہ اسی میں ان کی زندگی پوری ہو گئی قلق رہا تو صرف اس امر کا کہ ان کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی مقطع نے اول الذکر دونوں اشعار کا صحیح پس منظر سمجھنے میں پوری مدد کر دی ہے۔

---

۵ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

مولانا حالی مرحوم نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے۔ مسجد و مدرسہ و خانقاہ مساوی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ہمراہ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھٹ گیا اب مسجد مدرسہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر پی لینے میں کوئی عار نہیں۔ یعنی گو یہ مقامات اس شغل کے لائق نہیں مگر وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے۔ شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ یعنی مسجد مدرسہ خانقاہ جائے عبادت ہیں۔ مگر مرزا صاحب نے ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔

غالب ہمہ اوست کے قائل تھے۔ وہ اس شعر کے مرادف ۵

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا کہ جہاں پر خدا نہ ہو

خدا کے وجود کے پیش نظر اسے ہر جگہ موجود سمجھتے تھے اس سے انکار نہیں کہ میکدہ چھٹنے سے وہ حریفوں کے ساتھ مے نوشی فرماتے ہوتے تھے تو ان کے شعور میں خدا کا وجود وہاں بھی بیدار رہتا ہوگا اسی لیے میکدہ چھٹنے کے بعد مسجد مدرسہ اور خانقاہ میں وہ تخصیص نہیں پاتے۔

مطلع ؎ گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو؟

یہ غزل اور غزلوں کے ہمراہ دلی کے اردو اخبار میں شائع ہوئی۔ جب قلعۂ معلے میں مشاعرہ ہوا تو اس میں غزل غالب نے پڑھی تھی اس میں دس شعر ہیں۔ مصرع طرح بادشاہ دیا کرتے تھے۔ اس بار طرح دی گئی تھی۔

فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

غالب نے مقطع میں بادشاہ کے طرحی مصرعہ کو یوں نظم کیا ہے۔

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقول حضور
فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

(مرقع غالب ۸۷)

قطعہ در مدح سید الشہدا ؎

معذوری اُز حادثۂ رنجی ادان نیست
از نازکی بہ طبع گوارا گریستن
مسکیں نہ دیدۂ زمغاں شیوہ باتواں
درخواب گاہ بہمن و دارا گریستن

یہ دونوں اشعار اس قصیدہ کے ہیں جو غالب نے میر نظام الدین ممنوں کے ہاں ایک مشاعرہ میں پڑھے تھے۔ یہ مشاعرہ شاہ عالم کے قدیم مدرسہ میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ حاضرین مشاعرہ پر اس قصیدہ سے اتنی رقت طاری ہوئی کہ بزم مشاعرہ مجلسِ عزا بن گئی۔ اسے اعجاز سخن کہیے کہ اسی لمحہ مینھ برسنے لگا اور عجیب سماں بندھ گیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ بھی شریک بزم تھے۔ غالب قصیدہ پڑھ چکے تو آزردہ نے کہا "آسماں ہم گریست"

مذکورہ قصیدہ کی داد غالب کو بصرہ کے عربی و عجمی حضرات سے بھی ملی۔ میر اکبر مرزا نے بصرہ کی ایک بزم میں اس قصیدے کے چند اشعار پڑھ دیے۔ بارش ہو رہی تھی چند ہی اشعار کے بعد خوب رقت ہوئی اس بزم کے سرکار میں عرب، عجم اور ہند سبھی ممالک کے حضرات تشریف فرما تھے۔ بہت داد ملی خاص طور سے اس شعر کی بہت تعریف کی گئی ؎

مژدۂ شفاعت و صلہ صبر و خوں بہا ہیچ از کسے نہ خواستہ ما لا گریستن

کہتے ہیں کہ مرزا دبیر کو یہ شعر بہت پسند تھا اور انھوں نے اس مصرع پر مصرعے بھی لگائے تھے لیکن پسند نہ آئے تو کہا کہ جس مرتبہ کا یہ شعر ہے ویسے مصرعے نہیں لگ سکے۔ اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رشک آیدم بہ ابر کہ در حد وسع اوست
بر خاکِ کربلائے معلّیٰ گریستن
رفت آنچہ رفت بایدم اکنوں نگاہ داشت
از بہر نورِ دیدۂ زہرا گریستن
گویند چشم روشنیٔ دیدہ ماہ و مہر
نازد بہ ماتمِ شہِ والا گریستن
پاس ادب نہ خواست کہ اعجاز دم زند
بر مرگِ شاہ داشت مسیحا گریستن
با خاکیاں بہ ہنگمہ و افلاکیاں بہ رشک
خواہم بر آستانِ تو تنہا گریستن

(مرقع غالب) (اشعار از کلیات فارسی صفحہ ۱۹۳)

کتابیات

عودِ ہندی	
اردوئے معلیٰ	
کلیاتِ فارسی	غالب
درفشِ کاویانی	
دیوانِ غالب، مہرِ نیمروز	
خطوطِ غالب	مالک رام
ذکرِ غالب	مالک رام
مرقعِ غالب	پرتھوی چند
مکاتیب غالب	امتیاز علی عرشی
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی
خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام
آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد
مطالعۂ غالب	نواب جعفر علی خاں اثر
جلوۂ خضر	فرزند احمد صفیر بلگرامی
غالب کے خطوط	پروفیسر سید احتشام حسین

GHALIB AUR FANN-E-TANQEED

GHALIB ACADEMY
NEW DELHI